ایک ایسی تحقیقی اور تجزیاتی کتاب جس سے جدت پسندی کے تاریخی پس منظر، سامراج کی ریشہ دوانیوں اور TV کے روح رواں کی اصلیت و حقیقت سے تسلی بخش آگہی حاصل ہو سکتی ہے

ذاکر نائیک

ایک تجزیہ، ایک تحقیق

زیرِ اشراف
مفتی حماداللہ وحید

کاوش
سمیع الحق

مکتبہ عمر فاروق

ایک ایسی تحقیقی اور تجزیاتی کتاب جس سے جدت پسندی کے تاریخی پس منظر، سامراج کی ریشہ دوانیوں اور TV کے روح رواں کی اصلیت وحقیقت سے تسلی بخش آگہی حاصل ہوسکتی ہے

مؤلف
مفتی حماد اللہ وحید

نام کتاب .... ذاکر نائیک

مؤلف .... مفتی حماد اللہ وحید

اشاعت اوّل .... جنوری 2011

تعداد 1100

طابع .... فہیم گل پرنٹنگ پریس کراچی۔

ناشر .... فیاض احمد 0334-3432345 021-34594144

مکتبہ عمر فاروق 4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی

ملنے کے پتے

دارالاشاعت، اردو بازار کراچی

اسلامی کتب خانہ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

قدیمی کتب خانہ، آرام باغ کراچی

ادارۃ الأنور، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ

کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی

مکتبہ العارفی، جامعہ امدادیہ ستیانہ روڈ فیصل آباد

مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور

مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار لاہور

مکتبہ علمیہ، جی ٹی روڈ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

وحیدی کتب خانہ، محلہ جنگی قصہ خوانی بازار پشاور

انتساب

میں اپنے اس حقیر سی کاوش کی نسبت اپنے والدین کی طرف کرتے ہوئے قلبی سکون محسوس کر رہا ہوں جن کی تربیت لازوال شفقتوں اور دعاؤں کے بدولت قلم پکڑنے کے قابل ہوا خصوصاً میری امی جن کی دعائیں ہر وقت میرے لئے برگ سایہ دار کی طرح رہیں جو دعائیں ہمیشہ میرے ناکامی کو کامیابی میں نقصان کو نفع میں بدل دیتے ہیں۔

فہرست مضامین

"اختلاف"

اختلاف اور اتفاق کا باب نہایت معرکۃ الآراء اور ہشت پہلو باب ہے۔ حقِ اختلاف اور حدود وقیودِ اختلاف کی تعیین وتشریح کے حوالے سے اہل علم اور اربابِ تحقیق کے درمیان بڑی لے دے رہتی ہے اور رہے گی بھی۔ اختلاف اپنے وجود اور جزئیات کے ساتھ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ خود انسان ہے۔

سابق کی طرح آج بھی سلف کے ساتھ اختلاف کرنے والوں کی کمی نہیں ہے اور اس میں جہاں دانش وبینش کارفرما ہوتی ہے اور ہوسکتی ہے وہاں خبطِ عظمت ہوسِ زر اور نفسانیت کا عمل دخل بھی کم نہیں ہوتا ہے جب کہ ایک تیسری چیز جو اس کی وجہ ہوسکتی ہے وہ ادراک وآگہی کا فقدان ہے۔ اختلاف کرنے والا ظاہر ہے ہمیشہ امرِ اول کو باعثِ اختلاف باور کرانے پر مصر ہوگا۔

اور اس کے ناقدین اسے ازقسمِ ثانی یا ثالث ہی کہیں گے یعنی جہل یا ضلال......

اختلاف کرنے والا علم ودیانت کے تقاضے پورے کررہا ہے یا جہل وضلال کا شکار ہے یا پھر مغالطہ اور جہل مرکب میں مبتلا...... یہ فیصلہ کرنا آسان ہے اور نہ ضروری، البتہ اتنی بات تو ازراہِ عقل وعدل طے ہے کہ اختلاف کرنے والے کے ساتھ اتفاق ضروری نہیں ہے۔ ذاکر نائیک اور اس کے خیالات وافکار سے بھی بلاشبہ اتفاق کی طرح اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے اور اہل علم وتحقیق کو نہ صرف اس کا حق حاصل ہے بلکہ یہ ان کا دینی واخلاقی فرض ہے۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی نوعیت کی ایک کاوش ہے۔

فاضل مصنف نے کافی عرق ریزی کے ساتھ موضوع کو اس کی تمام جہات کے ساتھ زیرِ بحث لاکر اس پر گفتگو کی ہے اور حاصلِ گفتگو قلمبند کرکے اربابِ ذوق کی نذر کیا ہے۔ یہ دراصل مولانا کے تخصص فی الفقہ الاسلامی کا مقالہ ہے جو انہوں نے مولانا مفتی حماد اللہ وحید صاحب کی زیرِ نگرانی مکمل کیا ہے۔ مفتی صاحب کی خصوصیت ہے کہ اپنے شرکائے تخصص کو متنوع اور متشعب معاصر موضوعات پر مقالے تفویض کرتے ہیں اور مقالہ نگاروں کی مناسب رہنمائی اور نگرانی کرتے ہیں اور یوں اکثر وہ مقالہ جات عمدہ تحقیقی مواد پر مشتمل ہوتے ہیں اور کئی ایک تو تاریخی دستاویز کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں تجدد کے فتنے اور متجددین کے فلسفے پر تحقیقی نگاہ ڈالی گئی ہے اور اس کے مضمرات واثرات کو طشت ازبام کرنے کی ایک اچھی کوشش کی گئی ہے۔

قارئین انشاء اللہ اس کے مطالعے سے استفادہ کرکے ایک خوشگوار تسکین وتسلی محسوس کریں گے۔ اور ڈاکٹر ذاکر نائیک اور اس کے امثال واشباہ کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے میں انہیں سہولت ہوگی۔

عزیز الرحمٰن عظیمی

استاذ جامعہ فاروقیہ کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

آج ہم اس دور سے گزر رہے ہیں جس میں زمین نے اپنے تمام خزانے انسانوں کی ترقی کیلئے اُگل دیئے ہیں۔ سائنسی تعمیر و ترقی نے جدت طرازی کی بام ثریا کو چھولیا ہے۔ اونٹوں اور بیل گاڑیوں سے طیاروں اور خلائی جہازوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ موم کی شمعوں اور مٹی کے چراغوں سے بجلی کے قمقموں اور سرچ لائٹوں تک ترقی حاصل کی ہے۔ ہر قسم کے معدنی خزانے انسانوں کی غلامی کے طور پر اس کے تمدن کو بلند کر چکے ہیں۔ چکا چوند ترقی اور انکشافات نے دنیا کو حیرت کدہ بنا دیا ہے۔

انسان کی یہ روز افزوں ترقی اپنی جگہ لیکن اس دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی سے دنیا میں جو عظیم انقلاب رونما ہوا ہے، اس سے زندگی کا کوئی گوشہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں جس قدر ایجادات میں اضافہ ہوتا گیا۔ انسانی زندگی میں اتنی ہی سہل پسندی کے ساتھ ساتھ پریشانیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ مشین نے اگر ایک طرف انسان کو زندگی کی ہر سہولت اس کے دروازے پر مہیا کی، تو دوسری طرف اسی حضرت انسان کو لاینحل مسائل کی گھمبیر ڈور میں الجھا دیا، جو اب سلجھانے کے قابل ہی نہیں رہی، جہاں مشینی دور نے انسان کے جسمانی امراض اور مسائل میں اضافہ کیا ہے، تو وہاں، اس انقلاب نے علم وفن میں تحقیق ونظر کے نئے میدان کھولے ہیں، اس نئی تحقیق و ترقی نے حقوق اللہ کی جگہ، بنیادی حقوق، خالق کی جگہ مخلوق، معبود کی جگہ عبد، عقیدہ کی جگہ تجربہ پیغمبر کی جگہ سوشل سائنٹسٹ اور ایمان کی گہ سائنٹفک میتھڈ (Scientific method) نے لی ہے۔

اس صنعتی انقلاب کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ دنیائے اسلام کو سیاسی نقصانات پہنچے، بلکہ فکری، ذھنی، تمدنی اور ثقافتی اعتبار سے بھی مسلمان ناکارہ ومفلوج ہوکر رہ گئے، سائنسی ترقی اور تمدن یورپ کی ظاھری چمک دمک نے دنیا کو اس درجہ مسحور و مرغوب کردیا ہے کہ

یورپی انداز فکر سے ہٹ کر کسی حقیقت کے متعلق اب سوچا ہی نہیں جاتا۔ دنیائے یورپ کے تمدن اور طرز معاشرت کی نقالی تو کی ہی تھی، اب یورپی ذھن وفکر کو بھی اپنایا جارہا ہے۔

ایک طرف اگر یورپ کے سائنٹفک اور مادی علوم سے عام اور کچے اذھان اس قدر متاثر ہیں کہ انہوں نے روحانی اور مذھبی علوم میں بھی خواہ مخواہ یورپ کی بالادستی کو تسلیم کرلیا ہے تو دوسری طرف رہی سہی کسر پروفیسرز، ڈاکٹرز اور جدید تعلیم یافتہ نام نہاد دانشواروں کا وہ جدت پسند طبقہ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے مفکرین اسلام اور مذہبی سکالروں کی صورت میں پورا کررہے ہیں۔

یہ لوگ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت سامنے لائے جارہے ہیں، جونئی روشن خیالی کے دلفریب وگمراہ کن نعروں کے عنوان سے اسلام کا مسخ تصور پیش کیا جارہا ہے۔ جس کے خدوخال کا کوئی بھی پہلو قرون اولیٰ کے اعتقادی تصور اور اہل سنت والجماعت کے متواتر اور اجماعی فکر سے کسی قسم کی فکری ونظریاتی مطابقت نہیں رکھتا، جدید مفکرین کا یہ گروہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام دشمن قوتوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا اور اپنے جدید فکر وفلسفہ اور اپنے خودساختہ اصولوں کے ذریعے امت مرحومہ کا فکری رشتہ اہل سنت اور اجماعی فکر سے کاٹ دینا چاہتا ہے۔

ہمارے یہ جدید مفکرین مغرب کے پر فریب نعرے جو کبھی انسانی حقوق، آزادی رائے (Freedom of expression) آزادی نسواں، لبرل ازم (Lebrelisem) سیکولرزم، ماڈرنزم (Modernism) مساوات، پروگریس ڈیویلمنٹ (Development) اور سائنسی حقائق کو مقدس ٹھہرانے لگے ہیں، جو درحقیت مغرب کے مقصد میں انکار خدا اور رسول، انکار وحی اور انسان کی الوہیت پر مبنی ہے۔ انسانی حقوق (Human Rights) آزادی رائے اور آزادی اظہار (Freedom of expression) کی آڑ میں ہی انسان کو ہی معبود بنایا ہے اس وقت اہل مغرب کا صرف ایک نعرہ (Slogqn) ہے۔ لا الہ الا الانسان لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس حقیقت کے باوجود عصر حاضر کے جدیدیت پسند

مسلم مفکرین مغربی تہذیب، افکار اور فلسفے کی اسلام کاری میں مصروف ہیں، اور مغربی اقدار، روایات، عادات، افکار، نظام اور طریقوں کو اسلامی معاشروں میں عام کرنے اور اسلامی معاشروں کیلئے ان کی اجنبیت کو ختم کرنے کے طریقے اور سلیقے ڈھونڈ رہے ہیں۔

مغربی اصطلاحات کی اسلام کاری کرنے والے جدیدیت گزیدہ افراد سے اکثر ایک بنیادی غلطی ہوتی ہے کہ مغربی اور اسلامی اصطلاحات میں ظاہری یا جزوی، لفظی یا معنوی اشتراک کو دیکھتے ہوئے ایک پر دوسرے کو قیاس کرتے ہیں اور دونوں پر ایک ہی حکم لگا دیتے ہیں، اس بات کا دھیان کئے بغیر کہ ان کی اصطلاحات میں کیا کیا کفر پوشیدہ ہیں اسلام کاری میں مصروف ہیں۔

جس طرح اسلامی اصطلاحات کے معانی فقہاء وعلماء امت بتائیں گے، بالکل اسی طرح مغرب سے آنے والی اصطلاحات اور نظریات کی اصل اور مطلب مغرب کے فلسفی ان کے دانشوار اور ان اصطلاحات کے موجد ومصنف بتائیں گے۔ اس کے بجائے ان مغربی اصطلاحات کا ترجمہ کر کے ان کی اسلام کاری کر لینا ایک غیر علمی رویہ ہے لہذا مغربی اصطلاحات کا مفہوم سمجھنے کے لئے ہمیں مغرب کے بڑے فلسفیوں کا مطالعہ کرنا ہوگا، ورنہ ہم بدترین علمی خیانت کے مسلسل مرتکب ہوتے رہیں گے۔

مثلاً نفس (Self) کی تعریف مغرب میں کچھ اور ہے وہاں نفس حاسد، حریص، مریض لذت، حرص، حسد وھوس کا شکار کا وجود ہے، لیکن وہاں یہ نفس کی خامیاں نہیں، فطری خواص ہے مغرب ان کا رد نہیں کرتا، وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ انسان کے نفس میں خیر وشر دونوں ہوتے ہیں، اگر وہ خیر کو اختیار کرے تو افضل واعلیٰ ہو جاتا ہے، شر کو اختیار کرے تو پستیوں کے پاتال میں چلا جاتا ہے۔ جبکہ اسلام کا تصور نفس اس تصور سے بالکل الگ ہے۔

نکاح اور طلاق کی اصطلاح مشرق ومغرب مذاہب عالم، مغربی تہذیب، فلسفے اور تاریخ میں استعمال ہوتی ہے، تو کیا نکاح اور طلاق کا اسلام میں وہی مطلب ہے جو مغربی تہذیب میں ہے، اسلام میں نکاح عبادت ہے، فریضہ دینی ہے، نظام عفت وعصمت کی

حفاظتی دیوار ہے، مغرب میں یہ سول کنٹریکٹ (Civil Contract) ہے، جب تک فریقین معاہدہ چاہے باقی رکھیں، جب چاہیں ترک کردیں، ظاہر ہے اسلام اور مغرب میں یکساں اصطلاح کے باوجود دونوں کے مفاہیم مختلف ہیں، اس لئے تو اصطلاح کا تناظر جاننا ضروری ہے، جس کیلئے اس اصطلاح کے تاریخی و مابعدالطبعیاتی پس منظر کا فہم لازمی ہے۔

میراث کا قانون مغرب میں بھی ہے اور اسلام میں بھی تو کیا دونوں کی اصطلاح ایک ہونے کے باوجود دونوں تہذیبوں میں میراث کا تصور ایک ہے؟ کیا مغرب کے تصور علم، تصور حقیقت، تصور انسان میں خدا اور آخرت کا کوئی تصور پایا جاتا ہے؟ کیا ماڈرنزم (Modrenism) کا کوئی فلسفی آخرت اور خدا کو تسلیم کرتا ہے؟ اور علم کا مقصد خدا کی تلاش قربت، معرفت اور جستجو بتاتا ہے؟ جواب نفی میں ہے پھر جدیدیت اور اسلام کی اصطلاحات اگر بظاہر ایک جیسی بھی ہو تب بھی ان کے مطالب مختلف ہوں گے، کیونکہ ان کے تہذیبی، تاریخی مابعدالطبعیاتی تناظر بالکل الگ ہیں۔

سائنس اور مغربی تمدن کے طرف جھکنے والوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ ہمارے ہاں سائنس اور مغربی تمدن کے طرف سب سے پہلے جھکنے والوں میں سرسید احمد خان کا نام سرفہرست ہے۔ جو سائنس کی حقانیت کے ایسے قائل تھے کہ انہیں سائنس کی قربان گاہ پر مذہب کی بھینٹ چڑھانے میں بھی کوئی مضائقہ نظر نہ آیا۔ ان کی تفسیر قرآن دراصل ان کی اس جرات راندانہ کے نتیجے میں وجود میں آئی، اس تفسیر میں وہ سائنس کے نظریات کو حق مان کر ان عقائد کی تاویل کرتے نظر آئے، جنہیں سائنس قبول نہیں کرسکتی تھی، مثلا سائنس کی رو سے معجزہ ناممکن ہے، تو سرسید کو بھی معجزہ سے انکار لازم آیا۔

سرسید کے زمانے سے لے کر آج تک ہمارے ہاں یہ رجحان چلا آرہا ہے کہ یا تو ہم قرآن کریم کو سائنس کی روشنی میں دیکھ کر اس کی تعبیر و تاویل سائنسی اصولوں کے مطابق کرلیتے ہیں، یا جب کبھی سائنس کی کوئی نئی دریافت سامنے آتی ہے، تو ہم قرآن حکیم سے اس کا جواز فراہم کرکے دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ قرآن کریم میں اس کا ذکر پہلے سے

موجود ہے، یہ انداز نظر صریحاً ایک ایسے مغالطے پر مبنی ہے، جو سائنس سے ہماری مرعوبیت ظاہر کرتا ہے۔

جاوید غامدی، وحید الدین خان، طٰہٰ جابر العلوانی اور ڈاکٹر ذاکر نائیک کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ یہ حضرات جدید مغربی فلسفے کے ذیلی علوم، جدید سائنس اور سوشل سائنس کے نئے دریچے، فلسفہ سائنس سے قطعاً ناواقف ہیں۔

لہٰذا مغربی اصطلاحات اور نظریات کے ناممکن، محرف، غلط سلط، غیر علمی، غیر مصدقہ ترجمے کر کے ان کو خواہ مخواہ اسلامی سمجھنے لگتے ہیں، جو ایک بدترین علمی خیانت ہے، سائنس کا علم اپنی حدود میں کتنا ہی معتبر کیوں سمجھا جائے اسے قرآن کی صداقت اور صحت کا معیار بنانا دراصل قرآن حکیم کو سائنس کے تابع کر دینے کے مترادف ہے، ہمارے متجددین حضرات اور خاص کر ذاکر نائیک عرصہ دراز سے اس کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک نے اسلام کی فکری، عملی، تہذیبی بنیادوں پر جو بحثیں کی ہیں، ان میں متعدد جگہ ٹھوکریں کھائی ہے، ان مسائل میں ان کا ذھن معاملات کی قرار واقعی تحقیق کے بجائے ان چلتے ہوئے نعروں سے متاثر ہے، جو تجدد کے مکتب فکر نے چھوڑ رکھے ہیں، انہوں نے بھی دوسرے اہل تجدد کی طرح ''اجتہاد'' ''غور وتدبر'' ''مسائل کی اصل روح'' اور اس طرح ان مبہم اصطلاحات سے کام لیا ہے، جن کا مفہوم آج تک خود وہ بھی متعین نہیں کر سکے۔

مجھے آج بھی وہ وقت یاد ہے، جب نے میں طالب علمی کے لئے رخت سفر باندھا تھا، زندگی کا یہ سفر گزرتا گیا، آخر کار کراچی کی مشہور علمی درسگاہ جامعہ دار العلوم کراچی سے دورہ حدیث کیا، اس علمی سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے میں نے جامعہ انوار القرآن میں تخصص فی الفقہ الاسلامی میں داخلہ لیا، ہمارے یہاں تخصص کے نصاب میں آخری سمسٹر (Semester) میں کسی تحقیقی، فقہی یا علمی موضوع پر ۲۵۰ صفحات کا مقالہ لکھنا ہوتا ہے، امسال میرے استاد محترم حضرت مولانا مفتی حماد اللہ وحید صاحب نے مجھے مقالہ (Thesis) لکھنے کے لئے ''ڈاکٹر ذاکر نائیک کے افکار کا تنقیدی جائزہ''

کا موضوع دیا، چونکہ ڈاکٹر صاحب ہر چیز کا جواز سائنس سے ثابت کرتے ہیں اور سائنس کو مذہب اور قرآن کے جانچنے کے لئے معیار بناتے ہیں، وہ علم جو حقیقی ہے، اور خالق حقیقی نے وحی کے ذریعے عطاء کیا ہے، ظنی قیاسی غیر قطعی علم سے اس کا موازنہ کرتے رہتے ہیں، اس لئے میں نے اس مقالے میں پہلا باب، سائنس، فلسفہ، مذہب پر لکھا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ سائنس اور فلسفہ الگ چیزیں ہیں اور مذہب الگ چیز ہے، ان میں تطبیق ممکن ہی نہیں۔ دوسرا باب سائنس اور مذہب کا تعلق کیا ہے اور تیسرا باب ڈاکٹر ذاکر نائیک اور ان کے افکار کا تنقیدی جائزے پر لکھا گیا ہے۔

اس موقع پر میں اپنے استاد محترم حضرت مفتی حماد اللہ وحید صاحب دامت برکاتہم رئیس دارالافتاء جامعہ انوار القرآن کا بہت شکر گزار ہوں جن کی نگرانی اور سرپرستی میں میں نے اس مقالے کی تکمیل کی اور انہوں نے بروقت مقالے کا ایک ایک لفظ چیک کر کے غلطیوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ اور کتب کی طرف رہنمائی اور نائیک صاحب کے حوالے سے معلومات فراہم کی بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اگر استاد محترم کی سرپرستی نہ ہوتی تو شاید یہ کام کرنا میرے لئے انتہائی مشکل ہو جاتا۔ بڑی ہی ناسپاسی ہوگی اگر میں اس موقع پر اپنے دو بڑے بھائیوں مولانا فضل واحد صاحب اور مولانا سعید الحق صاحب کا تذکرہ نہ کروں جنہوں نے مجھے مقالے کی تیاری میں مالی پریشانی قریب آنے نہ دی اور اپنی وسعت سے بڑھ کر میری مدد کی اور وقتاً فوقتاً حوصلہ افزائی کی۔

اللہ پاک اس کام کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت بخش کر استاد محترم اور میرے لئے معاونین کے لئے نجات کا باعث بنا دیں۔ آمین

کتبہ سمیع الحق جدون
المتخصص فی الفقہ الاسلامی
بجامعہ انوار القرآن کراتشی
۱۲ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ

باب اول

مذہب، فلسفہ اور سائنس

جب کوئی شخص آنکھ کھولتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ ایک وسیع وعریض کائنات کے درمیان کھڑا ہے تو بالکل قدرتی طور پر اس کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ ''میں کیا ہوں؟'' اور یہ کائنات کیا ہے؟ اس کا اور اس کائنات کے درمیان کیا تعلق ہے؟ بظاہر یہ سوالات ایسے ہیں جن کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر اس طرح کا کوئی بورڈ لگا ہوا نظر آتا ہے، جہاں ان کا جواب لکھ کر دیا گیا ہو، یہ سوالات کیا ہیں اور ان کے جوابات کیسے تلاش کئے جاسکتے ہیں؟

مفکرین کا عام خیال ہے کہ مذہب فلسفہ اور سائنس ان ہی سوالوں کے جواب میں پیدا ہوئے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ان جوابوں میں ایک تاریخی ربط پایا جاتا ہے کہ ابتدائے افرینش میں جب فکر انسانی عہد طفلی سے گزر رہی تھی تو انسان یہ سمجھتا تھا کہ بہت سی غیر مرئی طاقتیں ہیں جو اس کائنات کی مالک ہیں ایک بڑے خدا کے تحت بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا اس کائنات کے انتظام کر رہے ہیں، مثلاً یونانی دیو مالا کائنات کی ہر قوت کے پیچھے کسی دیوی یا دیوتا کا ہاتھ کارفرما دیکھتی تھی دیوتاؤں کی یہ مجلس اسمان پر بیٹھ کر اس دنیا میں ہونے والے واقعات کا (چاہے وہ قدرتی ہو یا انسانوں کا پیدا کردہ ہو) فیصلہ کرتی ہے، اب بھی بہت سے لوگ اس قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں، مگر علمی دنیا میں عام طور پر اب یہ نظریہ ترک کیا جا چکا ہے۔

فکر انسانی کا یہ عہد طفلی جب ختم ہوا اور عنفوان شباب کا زمانہ آیا تو کائنات کی واقعات کی توجیہ میں دیوی اور دیوتاؤں کی جگہ قوت مادہ، شعور وغیرہ قسم کے مابعد الطبعیاتی تصورات نے لے لی، یہ زمانہ فلسفہ کا زمانہ تھا اس زمانے میں مابعد الطبیعاتی نظاموں نے اس کائنات اور انسان کے بارے میں مربوط اور مکمل قسم کے نظام پیش کیئے، جن کے

متعلق یہ سمجھا گیا کہ کائنات کے مسئلے کا حل ان نظاموں میں پوشیدہ ہے اور ہر واقعے کی توجیہ ان نظاموں کی مدد سے ممکن ہے یونانی عہد میں ارسطو اور افلاطون اور زمانہ جدید میں ھیگل کے نظام اس قسم کی عقلی توجیہوں کی مثال کی حیثیت سے پیش کیے جا سکتے ہیں، لیکن یہ عہد بھی اقتضائے زمانہ سے ختم ہوا۔

انسانی فکر کو جب بالیدگی اور پختگی نصیب ہوئی تو اس نے کائنات کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھنا شروع کیا یہ دور دور جدید ہے اور اس میں واقعات کی توجیہ غیر مرئی تصورات یا نظاموں کی مدد سے حل کرنے کے بجائے ان حقائق کی معرفت حاصل کی جاتی ہے جن کو انسان بہ چشم دیکھتا ہے اور جن کے بنیاد پر وہ علات اور علل جیسے سائنسی قوانین وضع کرتا ہے۔ سائنسی طریقے کے اس نئے تصور نے ایک طرف مابعد الطبعیاتی نظاموں کی بے وقعتی کا پول کھول دیا اور دوسری طرف مذہب کی ضرورت کو اس طرح باطل کر دیا کہ اب انسان کو ان بنیادی سوالوں کا جن کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا ہے۔ جواب دینے کے لئے کسی مافوق الفطرت ہستی کے اقرار کی حاجت نہیں۔

سائنس، فلسفہ اور مذہب یہ تینوں اقالیم ایک دوسرے پراثر انداز ہوتے رہے ہیں، اثر اندازی کی صورت بعض اوقات تعاون کی شکل اختیار کرتی رہی اور بعض اوقات پیکار کی مثلاً فلسفے نے مذہب کے لئے عقلی بنیادوں پر دفاعی نظام تیار کیئے اس لئے نہیں کہ وہ مذہب کی جگہ لے لیں بلکہ اس لئے کہ مذہب قبول کرنے میں عقل خارج نہ ہو، یعنی لوگ غلط فہمی کی وجہ سے فلسفیانہ نظاموں کو مذہب کا بدل قرار دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ فلسفے نے وہی کام سرانجام دیا ہے جو اس سے قبل مذہب کا تھا۔

مذہب، فلسفہ اور سائنس کے متعلق غلط فہمی دو طرح کی ہے، ایک یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ مذہب، سائنس فلسفہ تینوں ایک ہی قسم کے بنیادی سوالوں کے جواب میں پیدا ہوتے ہیں اور ثانیاً مذہب، فلسفہ اور سائنس تینوں ایک ہی قسم کے جواب فراہم کرتے ہیں۔

مذھبی، فلسفیانہ اور سائنسی سوالات کو ایک ہی قسم کے سوالات سمجھنے کا رجحان عام ہے اور کیا خاص اور کیا عام سب ہی اس غلط فہمی کا شکار ہیں مذھبی سائنسی اور فلسفیانہ جوابات کو

یا تو محض پیرایہ بیان کا اختلاف سمجھتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ فلسفہ اور مذہب کلی جواب فراہم کرتے ہیں اور سائنس جزئی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی دریافت کرے کہ پانی کیسے بنا اور اس کا جواب دیا جائے کہ پانی خدا نے بنایا ہے تو یہ جواب اس سوال کے ایک خاص معنیٰ کا جواب ہے۔ دوسرے معنوں سے اس سوال کا جواب یہ ہے ''کہ پانی ھائیڈروجن واکسیجن'' "H2O" کے امتزاج کا نام ہے۔ قطعاً ممیّز ہے، سوال کے دونوں معنوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے اس لئے یہ کہنا بجا نہیں ہے کہ سوال فی الاصل ایک ہی ہے اس کے جواب کے دو مختلف پیرائے ہیں فی الحقیقت یہ دو مختلف سوال ہیں جن کے دو مختلف جواب ہیں اور یہ دنوں جواب نہ تو ایک دوسرے کا بدل ہو سکتے ہیں نہ صرف پیرائے بیان میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور نہ ہی ایک جواب جزئی ہے اور دوسرا کلی، سوال کے دونوں معنوں کا منشاء مختلف ہے اور دونوں جوابوں سے جو نتائج نکلتے ہیں اور زندگی پر جس طرح اثر انداز ہوتے ہیں وہ بھی مختلف ہیں۔

فلسفہ، سائنس اور مذہب کو ایک سمجھنے میں بہت سے لوگ خلط مبحث کا شکار ہوئے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ان تینوں اقالیم کی بحث کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جائے تا کہ معلوم ہو جائے کہ مذہب کیا ہے؟ سائنس کیا ہے؟ اور فلسفہ کیا؟ کیا ان میں تطبیق ممکن ہے؟ کیا یہ ایک قسم کا سوال اور جواب مہیا کرتے رہتے ہیں؟ ان سب چیزوں کو جاننے کے لئے ہمیں یہاں ہر ایک کا تفصیلی تذکرہ کرنا پڑیگا۔

......☆☆☆......

مذہب

اللہ جل شانہٗ نے جس وقت دنیائے عالم کے اندر انسان کو مبعوث فرمایا اس وقت سے ہی اس ذات نے انسان کی رشد وھدایت، فلاح و بہبود، کامیابی وکامرانی، دنیا اور آخرت کی بہتری اور بھلائی کے لئے انسان کو اپنی شرافت وعظمت، انسانی بعثت کا مقصد وعرض اور انسانوں کو اس کی ترقی وتنزلی کا راز بتلانے کے لئے رہنماء اصول مرتب فرمادیئے اور اپنے احکام نازل فرما کر انسانوں کو اپنی رضامندی کی طرف رہنمائی فرمائی۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے ہر ہر لمحے کو اس کی عرض کے مطابق گزارنے کے لئے انسان کو رہن سہن، بود وباش معاشرت، اخلاق واطوار، حرفت ودستکاری، عرض تمام شعبہ ہائے زندگی کو سنوارنے اور اس کو مذہب اور کتاب وسنت کے سانچے میں ڈالنے کے لئے مختلف اوقات میں انبیاء بھیجتے رہے، جنہوں نے انسانی زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایا، زندگی کی اس طریقے کا نام مذہب ہے۔

مذہب ائمہ لغت کی نظر میں:

(Religion) مذہب کا ماخذ لاطینی لفظ (Religio) یعنی باندھنا ہے۔ لفظی حوالے سے بات کریں تو مذہب اتحاد اور ہم اہنگی کا قاعدہ ہے، کوئی بھی اصول جو ہمیں بحیثیت مجموعی باہم باندھتا ہے، وہ مذہب ہے۔

مذہب صاحب القاموس الوحید کی نظر میں:

المذھب: طریقہ، روش، اصل، عقیدہ، مسلک جیسے عرب میں کہا جاتا ہے ذھب مذھباً حسناً اس نے ایک اچھا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اور جیسے کہا جاتا ہے "مَایُدرىٰ له مذھباً" اس کی اصل ہی معلوم نہیں۔ [القاموس الوحید: ۵۷۸]

صاحب مصباح اللغات کا قول:

المذہب: مصدر ہے، روش، طریقہ، اعتقاد، اصل، جمع مذاہب تمذھب بالمذھب

اسی سے فعل بنا ہے، یعنی اس نے مذہب اختیار کیا مشہور مذاہب چار ہیں حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی۔[مصباح اللغات: ۲۶۹ مکتبہ خلیل]

صاحب منجد الطلاب کی نظر میں:

المذهب: مصدرٌ المعتقد، الطريقة، الاصل ومنه تمذهب بالمذهب اى اتبعه .[منجد الطلاب: ۲۲۲ دار المشرق بيروت لبنان]

صاحب المعجم الوسیط کا قول:

المذهب ، الطريقة، والمعتقد الذى يذهب عليه، يقال ذهب مذهباً حسناً. [المعجم الوسيط: ۳۱۸]

مذہب کی اصطلاحی تعریف صاحب القاموس الوحید کی نظر میں:

ایک دین کے ماننے والوں کے درمیان جو راہ ایک جماعت اپنا لیتی ہے وہ مسلک اور مذہب کہلاتا ہے۔ اسلام کے اصحاب مذاہب چار ہیں: امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ہر ایک کے طریقہ اخذ اور استنباط کا نام مذہب ہے۔ نیز اہل علم کے ہاں مذہب علمی اور فلسفی افکار ونظریات کا مجموعہ ہے۔ جو باہم مربوط ہوکر ایک منظم اکائی کی شکل اختیار کر لے، جیسے ”ذهب مذهباً حسناً“ اس نے اچھا طریقہ اختیار کیا۔[القاموس الوحید: ۵۷۸ ادارہ اسلامیات]

صاحب المعجم الوسیط کا قول:

وعند العلماء مجموعة من الاراء والنظريات العلمية والفلسفية استنبط بعضها يبعض ارتباط يجعلها وحدة منسقة.

[المعجم الوسيط : ۳۱۸]

صاحب الصحاح فی اللغات کا قول:

مبادئٌ واراءٌ متصلةٌ منسقةٌ لمفكرٍ اولمدرسةٍ ومنه

المذاهب الفقهية و الادبية و الفنية و العلمية و الفلسفية.

مختلف مفکرین کے اقوال مذہب کے بارے میں:

مذاہب عالم کی کثرت اوران میں عقائد واعمال کے تنوع کی وجہ سے مذہب کی کوئی جامع ومانع تعریف کرنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مفکرین نے مذہب کی مختلف تعریف کی ہے۔ ولیم جیمز نے مذہب کی یہ تعریف کی ''افراد کی اپنی تنہائی میں احساسات، افعال اور تجربات یہاں تک کہ وہ خود اپنے خیال کے مطابق الوہی چیز کے ساتھ تعلق کی تہہ تک پہنچ جائے'' ھوفوڈنگ مذہب کو یوں بیان کرتا ہے ''اقدار کو محفوظ بنانا مذہب ہے۔'' سکندر کے مطابق دیوتا میں یقین مذہب ہے، کانٹ نے کہا مذہب اراد لے کا معاملہ ہے مذہب کی مختصر اور سادہ ترین تعریف ای بی۔ ٹیلر نے کی ہے کہ ''مذہب روحانی موجودات پر اعتقاد کا نام ہے''۔

اس تعریف کی رو سے ہم دنیا کے بے شمار مذاہب کا جوہر سمجھ سکتے ہیں لیکن کئی مذاہب ایسے ہیں مثلاً (بدھ مت جن میں ایمان وعقائد کی چنداں اہمیت نہیں اور جن کو ہم زیادہ سے زیادہ ایک با خلاق زندگی گزارنے کا ضابطہ کہہ سکتے ہیں) غالباً اسی کے پیش نظر میتھو ارنلڈ نے مذہب کو جذبات سے متاثر اخلاق یا جذباتی اخلاق کہا ہے۔ پروفیسر وائٹ ھیڈ (White Head) لکھتے ہیں ''مذہب اعتقاد کی اس قوت کا نام ہے۔ جس سے انسان کی اندرونی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ مذہب ان صداقتوں کے مجموعے کا نام ہے۔ جن میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ انسانی کردار میں انقلاب پیدا کردیں بشرطیکہ انہیں خلوص کے ساتھ قبول کیا جائے۔ اور بصیرت کے ساتھ سمجھا جائے۔

[اسلامی نظریہ حیات: ص ۵۰ شعبہ تصنیف وتالیف جامعہ کراچی]

مذہب کا ارتقاء:

مذہب کے اغاز کے بارے میں اس وقت دو تصورات پائے جاتے ہیں۔ ایک ارتقائی تصور اور دوسرا وہ تصور جو خود مذاہب نے پیش کی ہے۔

مذہب ارتقائی تصورات کی رو سے انسان کی ابتداء غیر انسانی اور نیم انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا مرتبہ انسانیت تک پہنچا ہے۔ اور اس تدریجی ارتقاء کے طویل سفر میں کوئی نقطہ نظر ایسا نہیں ہوسکتا جہاں سے غیر انسانی حالت کا وجود ختم کر کے نوع انسانی کا اغاز تسلیم کیا جائے۔ بایں تصور انسان کی ابتداء گمراہی اور لاعلمی سے ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ انسانوں نے مشرکانہ خدا پرستی اور توحید پرستی اختیار کر لی جبکہ مذہبی نقطہ نظر سے خدا نے جب انسانوں کو اس دنیا میں بھیجا تو ساتھ ہی اس کے تمام جسمانی ضروریات کی طرح روحانی ضروریات (ھدایت) کا بھی سامان کیا پہلے شخص حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ اس کے بعد جب لوگوں میں گمراہی پھیلی تو خدا نے پیغمبر بھیجے جنہوں نے دنیا کو راہ ہدایت دکھائی اس اعتبار سے توحید قدیم ہے اور شرک جدید۔

اس وقت دنیا میں جتنے بڑے مذاہب ہیں (عیسائیت، یہودیت، اسلام وغیرہ) ان کے داعی خدا کی پیغمبر ہی تھے اور اس بنا پر ابتداً ان کی تعلیمات جزوی فرق کو چھوڑ کر یکساں تھی۔ بعد میں اسلام کو چھوڑ کر ہر مذہب کے پیروکاروں نے اپنے مذہب میں ترامیم کر لیں۔ اب ان کے جو عقائد ہیں وہ درحقیقت وہ عقائد نہیں ہیں جو ان مذاہب کے پیغمبروں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پیش کیے تھے۔ بلکہ وہ ہیں جو بعد میں تحریفات کے بعد بن گئے تھے۔

اسلام کے اغاز کے بارے میں اسلام کا نقطہ اغاز یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء ایک ہی دین کی تبلیغ کی اور وہ دین اسلام ہے۔

مذہب ایک بنیادی اور اہم ضرورت ہے:

تاریخ انسانی میں کوئی معاشرہ، کوئی تمدن اور کوئی قوم ایسی نہیں گزری جو مذہب سے کلیتاً بے نیاز رہی ہو۔ مذہب سے انحراف کی جتنی راہیں بھی انسان نے اختیار کی ہے بالا خر وہ سب غلط اور تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ عقلی تجربہ اور تاریخی تجربہ دونوں اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ مذہب کے بغیر انسانی زندگی، حقیقی کامیابی، سکون و اطمینان

اور امن و امان نہیں ہو سکتی ہے اور وہ مذہب جو ابھی تک اپنی حقیقی شکل میں موجود اور محفوظ ہے اور زندگی کے تمام مسائل کو بحسن وخوبی حل کر سکتا ہے وہ مذہب اسلام ہے۔

اسلام کسی ایسے مذہب کا نام نہیں جو صرف انسان کی نجی اور انفرادی زندگی کی اصلاح کا داعی ہو اور جس کا کل سرمایہ حیات کچھ عبادات، چند اذکار اور مٹھی بھر رسوم پر مشتمل ہو۔ بلکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ جو خدا اور اس کے آخری نبی ﷺ کی ہدایت کی روشنی میں زندگی کے تمام شعبوں کی تعمیر اور صورت گری کرتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو کو ہدایت الٰہی کے نور سے منور کرتا ہے۔ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشرتی ہو یا تمدنی، مادی ہو یا روحانی، معاشی ہو یا سیاسی، ملکی ہو یا بین الاقوامی سب میں انسانی ضروریات کا پاس ولحاظ رکھا گیا ہے۔

مذہب اسلام کا نقطہ اغاز:

مذہب اسلام کا نقطہ اغاز نفس انسانی کی اصلاح ہے۔ وہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے روشناس کراتا ہے۔ خدا، رسول، کتاب اور یوم اخرت پر ایمان کے ذریعے سے کائنات اور اس کے حقیقتوں، زندگی اور اس کے مقاصد سے انسان کا رشتہ صحیح بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔

توحید، رسالت، اخرت وہ بنیادیں ہیں جن پر اسلام کا پورا نظام قائم ہے۔ اسلامی زندگی کا ہر پہلو انہی بنیادوں سے وابستہ ہے اور زندگی کی بنیادی مسائل کے حل کی واحد صورت وحی اور رسالت ہے یہ نہ تو دیگر علوم کی طرح مادی اشیاء تک محدود ہیں اور نہ خطا پذیر ہیں۔ کیونکہ وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبرئیل امین کے واسطے پیغمبر پر نازل ہوتی ہے۔ وحی چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے لہذا اس میں خطأ کی کوئی احتمال نہیں وحی کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ آیئے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

دو کام ناگزیر ہیں:

ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کو اس دنیا میں ازمائش کے لئے بھیجا ہے

اور اس کے ذمے کچھ فرائض عائد کئے ہیں۔ پوری کائنات کو اس کی خدمت میں لگا دیا لہٰذا دنیا میں آنے کے بعد انسان کے لئے دو کام ناگزیر ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اس کائنات سے جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ٹھیک ٹھیک کام لے اور دوسرے یہ کہ اس کائنات کو استعمال کرتے ہوئے اللہ کے احکام کو مدنظر رکھے۔ اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو ان دونوں کاموں کے لئے انسان کو علم کی ضرورت ہے۔ اس لئے جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی کونسی چیز کے کیا خواص ہیں؟ ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دنیا کی کوئی چیز اپنے فائدے کے لئے استعمال نہیں کر سکتا۔ نیز جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کونسے کاموں کو پسند اور کن کو ناپسند فرماتا ہے۔ اس وقت تک اللہ کی مرضی پر کاربند ہونا ممکن نہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں۔ جن کے ذریعے اسے مذکورہ باتوں کا علم ہوتا ہے۔ ایک انسان کے حواس، یعنی آنکھ کان، ناک، منہ اور ہاتھ پیر، دوسرے عقل اور تیسرا وحی۔ چنانچہ انسان کو بہت سی باتیں اپنے حواس کے ذریعے معلوم ہو جاتی ہے بہت سی عقل کے ذریعہ اور جو باتیں ان دونوں ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتی ان کا علم وحی کے ذریعے عطاء کیا جاتا ہے۔

حواس کے ذریعے صرف مادی اشیاء کا علم ممکن ہے جو ہمارے علم کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ یقینی ذریعہ سمجھا جاتا ہے دنیا سے متعلق جس قدر محسوسات کا ہم کو علم ہے۔ ان سب کی بنیاد یہی حواس ہیں۔ ان ہی کی بناء پر ہم تجربہ اور مشاہدہ کے بعد طبعی قوانین دریافت کر کے اپنے سائنسی علوم کو ترتیب دے سکتے ہیں لیکن حواس اپنی وسعت کے باوجود محدود ہیں یہ ہمیں صرف ان اشیاء سے متعلق علم فراہم کرتے ہیں جن کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح عقل انسان کو جانوروں سے ممیز کرتی ہے۔ انسانی علوم میں ترتیب اور ربط اسی کی بنا پر ہے۔ لیکن جب ہم اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا محض عقل

زندگی کے بنیادی مسائل کا حل بھی دریافت کر سکتی ہے۔ تو نتیجہ نفی کی صورت میں نکلتا ہے۔

حواس جو صرف مادیات دریافت کرتے ہیں عقل مادیات سے بلند ذہنیات اور عقلیات کو جبکہ وحی اس سے بھی اونچی جاتی ہے وہ ذھنیات اور عقلیات سے بلند تر حقائق یعنی غیبیات سے روشناس کراتی ہے اور اس ذریعہ علم سے حقائق اسی طرح سامنے آتے ہیں جس طرح وجدانیات، فطریات، بدیہات اور محسوسات میں سامنے آتے ہیں۔ اور انہی کی طرح وہ یقینی بھی ہوتے ہیں اور چونکہ اس ذریعے میں علم انسانی کے عام ذریعے اور طریقے یعنی وجدان، فطرت نوعی، ہدایت اولیہ، احساس اور غور وفکر سے معلومات حاصل نہیں کئے جاتے بلکہ خود علاّم الغیوب وہ علم ان انسانی وسائط کے بغیر ان کو عطاء کرتا ہے۔ شرع کی محاورے میں اس کو وحی اور الہام کہتے ہیں۔

وحی کا مفہوم:

خدا تعالیٰ سے قطعی ہم کلامی کا شرف حاصل کرنا وحی کہلاتا ہے۔ جو نوع بشری میں خاص قسم کے افراد کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے آپ ﷺ کی شان بشریت کے ساتھ آپ ﷺ کی اسی امتیازی صفت کا تذکرہ فرمایا ہے:

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ﴾

[سورۃ کہف: ۱۱۰]

یعنی میں بھی یقیناً ایک بشر ہو مگر میرا امتیاز یہ ہے کہ مجھ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے اور اس کا سب سے اہم سبق توحید الٰہی ہے۔ ہر بشر میں اس کی اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے خالق کے ساتھ بلا واسطہ ہمکلامی سے مشرف ہو سکے اس لئے قدرت اپنی جانب سے اس صلاحیت کے چند افراد منتخب فرمالیتی ہے پھر ان کے ذریعے سے عام بشر تک اپنے احکام پہنچادیتی ہے۔

وحی اور ایحاء عربی زبان کے الفاظ ہیں اور لغت میں اس کی معنی ہے۔

﴿اشارو أو ماکلمه بکلامٍ یحفی علی غیره﴾

[المعجم الوسیط: ۱۰۱۸]

جلدی سے پوشیدہ اشارہ کرنے اور دوسروں سے چھپا کر کسی سے چپکے چپکے بات کرنے کے ہیں، جیسے کہ ابوذویب کا شعر ہے۔

فقال لها وقد اوحت اليه
الا الله امّـــك ماتضيف

''اس مرد نے کہا جب عورت نے اس سے پوشیدہ طریقے سے گفتگو کی تیری ماں کا کیا کہنا کہ وہ فال بدلیتی ہے۔''

امام کسائی عرب کا محاورہ بتاتا ہے کہ'' وحيت اليه بالكلام و اوحيه اليه هو انْ تكلمه بكلامٍ تخفيه من غيره'' یعنی کسی سے اس طرح باتیں کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ، ابواسحاق لغوی کہتا ہے واصل الوحی فی اللغة كلها اعلامٌ فی خفاء۔ ''وحی کا اصل مفہوم اس کے تمام معنوں پر'' چھپا کر اطلاع دینے'' ہیں۔

قرآن مجید میں وحی کا لفظ اپنے اصل مفہوم کے اندر تین معنوں میں آیا ہے۔

(۱) فطری حکم:

﴿ وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ﴾ [النحل: ٦٧]
''تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو وحی کی''

﴿بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا﴾ [الزلزال: ٥]
''اس لئے تیرے پروردگار نے زمین کو وحی کیا''

(۲) دل میں بات ڈال لینا:

﴿وَاَوْحَيْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی اَنْ اَرْضِعِيْهِ﴾ [قصص: ٧]
''اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو'' وحی کیا'' کہ اس بچہ کو دودھ پلاؤ''

(۳) چپکے سے بات کرنا:

﴿يُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ﴾ [الانعام: ١١٢]
''یہ ایک دوسرے کو چکنی چپڑی بات'' وحی کرتے ہیں''

﴿وان الشَّیٰطِینَ لیُوحُوْنَ الیٰ اولیئآئِهِم﴾[الانعام: ۱۲۲]

''اور شیطان لوگ اپنے دوستوں کو''وحی'' کرتے ہیں''

وحی کے ان تینوں معنوں میں ایک مفہوم مشترک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ''منہ سے لفظ نکالے بغیر ایک شخص کا دوسرے شخص کو مفہوم سمجھا دینا'' یا اگر الفاظ ہوتو وہ اس قدر پوشیدہ ہوں کہ دوسرے ان کو نہ سن سکیں۔ اس لئے اشارہ کرنا، لکھنا، دل میں ڈال دینا، حکم فطری، خط وکتابت اور جانوروں کا اپنی حرکات سے اپنا مطلب ظاہر کرنا یہ سب اس کے معنوں میں داخل ہیں۔ لیکن یہ سب اس لفظ کے لغوی مفہوم ہیں۔

شرعی اصطلاح میں''وحی'' کی تعریف یہ ہے:

كلام الله المنزل على نبى من انبيائه

''اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جو اس کے کسی نبی پر نازل ہو''

[عمدة القاری شرح الصحیح البخاریؒ: ۱/۱۸]

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ لفظ''وحی اپنے اصطلاحی معنی میں اتنا مشہور ہو چکا ہے کہ اب اس کا استعمال پیغمبر کے سواء کسی اور کے لئے درست نہیں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ''وَحیٌ''اور ایحاءٌ دونوں الگ الگ لفظ ہیں اور دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔''ایحاءٌ'' کا مفہوم عام ہے اور انبیاء پر وحی نازل کرنے کے علاوہ کسی کو اشارہ کرنا اور کسی غیر نبی کے دل میں کوئی بات ڈالنا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے۔ لہٰذا یہ نبی اور غیر نبی دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف''وحی'' صرف اس الہام کو کہتے ہیں جو انبیاء پر نازل ہو یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے لفظ''ایحاء'' کا استعمال تو انبیاء اور غیر انبیاء دونوں کے لئے کیا ہے۔ لیکن لفظ وحی سوائے انبیاء کے کسی اور کے لئے استعمال نہیں فرمایا۔ [فیض الباری: ۱/۱۹]

بہر حال وحی نام ہے اس علم کا جو خدواند تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں پر انسانوں کی ہدایت ومعرفت کے لئے منکشف کرتا ہے، دوسرے تمام انسانوں تک یہ علم روایت اور نقل کے ذریعے سے پہنچتا ہے، چنانچہ وحی یا بالفاظ دیگر رسالتی علم سے متعلق تین باتیں

خصوصی ہیں۔

(۱) اس سے جو علم حاصل ہوتا ہے۔ وہ عام طور پر ان اشیاء سے متعلق ہوتا ہے۔ جو ظاہری حواس سے مخفی ہیں۔

(۲) اس علم کا ذریعہ عام ذرائع علم سے مختلف ہوتا ہے اس میں نہ ادراک حسی ہوتا ہے اور نہ استدلال منطقی بلکہ ایک ناقابل بیان پیرائے میں نبی یک بیک نئے حقائق سے ہم کنار ہو جاتا ہے، اس کے نزدیک یہ ان حقائق سے زیادہ واضح ہوتے ہیں جن کا ہم اپنے حواس سے ادراک کرتے ہیں۔

(۳) الہامی علوم، اشراقی علوم کی طرح بے معنی اور معاشرتی زندگی سے بے تعلق نہیں ہوتے بلکہ وہ زندگی ہی کی ہدایت اور شرح کے لئے ہوتے ہیں، اس لحاظ سے وہ ایک عملی نظام حیات کی بنیاد بنتے ہیں۔

مذہب کے بنیادی حقائق:

مذہب کے بنیادی حقائق ، خدا، آخرت اور نبوت ہیں مذہب میں خدا، آخرت اور نبوت کا تصور بنیادی اکائیاں ہیں، جس پر ہر آسمانی مذہب کا اساس ہوتا ہے۔

مختلف اقوام و مذاہب نے ان بنیادی اکائیوں کے مختلف تصورات پیش کیئے ہیں۔ اس لئے ان چیزوں کے تصور نے ان کے مذہب کے پیروکاروں کی سیرت و کردار پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ مثلاً ھندو کثرت خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ کچھ ھندو تین خداؤں اور کچھ لاتعداد خداؤں پر یقین رکھتے ہیں۔ ھندو اور مسلمانوں کے تصور خدا کے بارے میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ ھندو اس بات کے قائل ہیں کہ ہر چیز خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان، مقدس ہے اس لئے ھندو، درختوں، سورج، چاند، جانوروں اور حتی کہ ان کے لئے ہر شئے خدا ہے، ان کا خدا کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ ہر چیز خدا ہے۔

"They belive that every thing is God"

اس کے برعکس اسلام انسان سے کہتا ہے کہ وہ خود کو اور اپنے اطراف کی اشیاء کو خدا کی تخلیق سمجھے لہٰذا مسلمان ہر شئے کو خدا کی ملکیت سمجھتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم سمجھتے ہیں کہ ''ہر شئے کا تعلق اللہ سے ہے'' درخت، سورج، چاند اور تمام اشیاء خدا کی ہی ہے۔ یہ کائنات بھی اس سے تعلق رکھتی ہے۔

اسی طرح خدا کے علاوہ آخرت اور نبوت کا تصور بھی ان مذاھب میں مختلف ہے۔ لیکن مذہب اسلام کا تصور خدا آخرت، نبوت ان تصورات سے یکسر مختلف ہیں، جو دوسرے مذاہب میں پائے جاتے ہیں اور ان مذاہب کے لئے کلیدی عقائد کی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں۔

اسلام میں تصور خدا:

اسلام کے پورے اعتقادی اور عملی نظام میں پہلی اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے باقی جتنے اعتقادات اور ایمانیات ہیں سب اسی ایک اصل کی فرع ہیں اور جتنے اخلاقی احکام اور تمدنی قوانین ہیں سب اس مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں یہاں جو کچھ بھی ہے اس کا مصدر اور مرجع خدا کی ذات ہے۔

ملائکہ پر ایمان اس لئے ہیں کہ وہ خدا کے ملائکہ ہیں، کتابوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کی نازل کی ہوئی ہیں، رسولوں پر ایمان اس لئے ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے ہیں، یوم آخر پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے انصاف کا دن ہے، فرائض اس لئے فرائض ہیں کہ خدا نے انہیں مقرر کیا ہے، حقوق اس لئے حقوق ہیں کہ وہ خدا کے حکم پر مبنی ہیں، اوامر کا امتثال اور نواہی سے اجتناب اس لئے ضروری ہے کہ وہ خدا کی جانب سے ہیں، عرض ہر چیز جو اسلام میں ہے خواہ وہ عقیدہ ہو یا عمل اس کی بنا صرف ایمان باللہ پر قائم ہے۔

خدا کی نہایت جامع تعریف:

اسلام میں خدا کی نہایت جامع اور مختصر ترین تعریف سورۃ اخلاص کی چار آیات میں موجود ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ o اللّٰهُ الصَّمَدُ o لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ o وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُواً أَحَدٌ o [سورہ اخلاص]

ترجمہ: ''کہو وہ اللہ یکتا ہے، اللہ سب سے بے نیاز ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے، اور نہ وہ کسی کی اولاد اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔''

سورۃ اخلاص دین یا الہیات کی بہترین کسوٹی ہے چار آیات پر مشتمل یہ سورت خدا کی معرفت کے لئے ایک کسوٹی اور ایک پیمانے کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر کوئی خدائی کا امیدوار ہے تو یہ ضروری ہے کہ اسے بھی اس کسوٹی پر پرکھا جائے چونکہ اس سورت میں اللہ رب العزت کی یکتا صفات کا احاطہ کیا گیا ہے لہذا اس سورت کی روشنی میں جھوٹے خداوٴں اور الہیاتی امیدواروں کو بآسانی رد کیا جا سکتا ہے۔

توحید کا وسیع مفہوم:

اللہ کی توحید متعدد اور مختلف حیثیتوں سے ثابت ہے۔ مثلا

قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَد: وہ ایک ہے۔ [اخلاص]

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَئٌ

اس کائنات میں کوئی اس کی نظیر و شبیہ نہیں دوسرے یہ کہ وہ ایک ہی مستحق عبادت ہے تیسرے یہ کہ وہ ایک ہی ہے یعنی اپنے وجود ازلی ابدی میں ایک ہی ہے وہ اس وقت بھی موجود تھا جب کوئی چیز موجود نہ تھی اور اس وقت بھی موجود رہے گا جب کوئی چیز موجود نہ رہی گی۔ اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے۔

لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ وَلِيٌّ مِنَ الذُلِ. [سورۃ الاسراء: ۱۱۱]

''اس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے، اور نہ وہ عاجز ہے۔''

اس کے علاوہ حق تعالیٰ کے واحد حقیقی ہونے پر تکوینی علامات اور دلائل موجود ہیں، جن کو ہر عالم اور جاہل سمجھ سکتا ہے، کہ اسمان و زمین کی تخلیق، رات اور دن کے دائمی

انقلاب اس کی قدرت کاملہ اور توحید کے واضح دلائل ہیں، کہ ان چیزوں کی پیدائش اور بقاء میں کسی دوسری ہستی کا کوئی دخل نہیں۔

اسی طرح پانی پر کشتیوں کا چلنا ایک بڑی آیت قدرت ہے، کہ پانی کو حق تعالیٰ نے ایسا جوہر سیال بنادیا کہ رقیق اور سیال ہونے کے باوجود اس کی پیٹھ پر لاکھوں من وزن کے جہاز بڑے بڑے وزن کو لے کر مشرق سے مغرب تک منتقل کردیتے ہیں اور ان کو حرکت میں لانے کے لئے ہواؤں کو چلانا اور پھر اپنی حکمت کے ساتھ اس کے رخ بدلتے رہنا یہ سب اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان چیزوں کو پیدا کرنے والا اور چلانے والا کوئی بڑا علیم وخبیر اور حکیم ہے۔

اسی طرح آسمان سے پانی کو قطرہ قطرہ کرکے اس طرح نازل کرنا کہ اس سے کسی چیز کو نقصان نہ پہنچے یہی پانی اگر بالفرض دفعتاً سیلاب کی طرح آتا تو پھر کوئی جانور اور انسان نہ رہتا اور اس کے ساتھ زمین میں اس پانی کی سٹوریج (Storage) کا نظام بنایا اور اس کو سڑنے سے بچایا۔

﴿فَأَسْكَنَّاهُ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّا عَلَى ذَهَابٍ بِهِ لَقَادِرُونَ﴾

[المؤمنون: ۱۸]

"یعنی ہم نے ہی پانی کو زمین کے اندر ٹھہرادیا اگرچہ ہمیں اس کی بھی قدرت تھی کہ بارش کا پانی برسنے کے بعد بہہ کر ختم ہوجائے۔"

خدا موجودات کا خالق اور تقدیر ساز کے ساتھ ساتھ ھادی وراہنماء بھی ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی o وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی﴾ [اعلیٰ: ۱، ۲]

اور اس نے انسان کو جب حیات ارضی کے لئے میدان میں اتارا تو اسے اطمینان بھی دلایا کہ تم کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا جارہا ہے، تمہاری راہنمائی کی جائیگی۔

﴿ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [البقرة:۳۸]

الغرض عقیدہ توحید اسلام کا سب سے بنیادی عقیدہ ہے، یہ صرف ایک نظریہ نہیں بلکہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانے کا واحد ذریعہ ہے جو انسان کی تمام مشکلات کا حل اور ہر حالت میں اس کے لئے پناہ گاہ اور ہر غم وفکر میں اس کا غمگسار ہے، اس توحید کا مالک صرف قہار اور جبار بن کر اپنے تخت پر براجمان نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے بندوں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ بھی پھیرتا ہے، ان کے جلتے ہوئے سینوں کو تسکین کی ٹھنڈک پہنچاتا ہے ان کی ڈھارس بندھاتا ہے۔

نبوت:

انسانوں کو جیسے ہوا، پانی، کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح باطنی زندگی کے لئے بھی کچھ اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس باطنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے ہیں۔ سب سے پہلے آدم علیہ السلام کو بھیجا ہے انہیں منصب نبوت سے سرفراز کیا اور پھر ان کے اولاد نے اپنے بیٹوں پوتوں تک ان ہدایات کو منتقل کیا، لیکن جوں جوں انسانی نسل پھیلتی گئی اور دور دراز کے علاقوں میں آباد ہوتی گئی، اس تعلیم کی نقوش مدھم پڑتے گئے، یہاں تک کہ بہت سے لوگوں نے ان تعلیمات کو فراموش کر دیا، ان جھگوں پر اللہ تعالیٰ نے دوسرے انبیاء بھیجے تاکہ انسانوں کی ھدایت اور رہنمائی کا کام سرانجام دیں اور یہی سلسلہ چلتا رہا ایک اندازے کے مطابق تمام انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔

نبوت کی حقیقت:

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”نبوت انسانیت کے رتبے سے بالاتر ہے۔ وہ عطیہ الٰہی وموہبت ربانی ہے۔ اور سعی ومحنت اور کسب وتلاش سے نہیں ملتی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَه﴾ [الانعام: ۱۲۴]

''اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنے رسالت کا کام کس سے لے اور کیسے لے۔''

اگر چہ یہ بات صحیح ہے کہ وہ عبادات ریاضیات جو فکر و مراقبے پر مشتمل ہوں اور ریا سے پاک ہو، نفس انسانی میں اثاروحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، تاہم نبوت کا منصب خاص اور کوشش سے کسی کو حاصل نہیں ہوتا، وہ نوع انسانی کے لئے اکتسابی چیز نہیں ہے۔ ہر چند کہ منشائے نبوت کے مطابق ریاضت و عمل نیک قبول وحی کی استعداد کے لئے ضروری ہے۔

چنانچہ اس اصول کے مطابق اکثر انبیاء کے اغاز وحی کے حالات میں مرقوم ہے کہ انہوں نے ایک مدت تک عبادت و مراقبے میں بسر کیا ایک ایک مہینہ اس طرح بسر کیا کہ وہ مادی الائشوں سے یکسر الگ ہو گئے۔

اس عبادت و ریاضت کے ساتھ نبوت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا حامل حسن صورت، اعتدال مزاج، طہارت نسب اور کرم اخلاق کی صفات سے متصف ہو حق کے متلاشی لوگوں سے نرم خو اور متواضع ہو اور دشمنان حق کے ساتھ شدید اور قوی ہو وہ راست گفتار اور امانت دار ہوتا ہے۔ اور محاسن اخلاق سے آراستہ ورازئل سے پاک وصاف ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ برائی کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہے۔ تمام دنیائی قومیں اس کے سامنے طوعاً و کرھاً سرنگوں ہو جاتی ہے۔ مگر وہ اس پر مغرور اور درشت مزاج نہیں ہوتا۔ یوں وہ رسالت کے بار عظیم کو اٹھاتا اور اس کا پورا حق ادا کرتا ہے۔ اگر چہ انبیاء بشرئیت وانسانیت میں عام انسانوں کے ساتھ برابر کے شریک ہوتے ہیں مگر عقلیت و معنویت میں وہ ان سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے نفوس قدسیہ کی بنا پر دوسرے انسانوں پر برتری حاصل ہوتی ہے۔

ہر نبی قابل اطاعت ہوتا ہے:

قرآن کی رو سے نبی کی مکمل اطاعت اور پیروی ضروری ہوتی ہے اور ایسا سمجھنا شرط ایمان ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف عقائد اور عبادات میں بلکہ زندگی کے تمام

عملی مسائل میں بھی اس طریقہ کی پیروی کی جائے جس پر خدا کے رسول ﷺ چلے ہیں۔ کیوں کہ خدا نے جس ''علم'' اور نور بصیرت سے انہیں بہرہ ور فرمایا تھا، اس سے غلط اور صحیح طریقوں کا فرق یقینی طور پر انہیں معلوم ہو جاتا تھا۔ اس لئے جو کچھ ترک یا اختیار کرتے تھے اور جو کچھ حکم دیتے تھے وہ سب خدا کے طرف سے تھا عام انسان سالہا سال بلکہ قرنہا قرن کے تجربات کے بعد بھی غلط اور صحیح کے امتیاز میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوتے اور جو تھوڑی بہت کامیابی نصیب ہو بھی جاتی ہے وہ یقین کامل کی ٹھوس بنیادوں پر قائم نہیں ہوتی، بلکہ اس کی بناء محض قیاس اور استقراء پر ہوتی ہے جس میں بہر حال غلطی کا اندیشہ باقی رہتا ہے۔ بخلاف اس کے انبیاء علیہم السلام نے زندگی کے معاملات میں جو طریقے اختیار کیے گئے تھے، جن پر چلنے کی تعلیم دی وہ ''علم'' کی بنا پر اختیار کیے گئے تھے اس لئے ان میں کوئی غلطی کا امکان نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار انبیاء کی اطاعت اور ان کے اتباع کا حکم دیتا ہے۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا من رسولٍ الا ليطاع باذن الله﴾[النساء: ٦٤]

''اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ بحکم خدا اس کی اطاعت کی جائے۔''

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾[النساء: ٨٠]

''جن نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔''

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حسنةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا......﴾

[الاحذاب: ٢١]

''بیشک تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے اور اس شخص کے لئے جو روز آخرت سے ڈرتا ہے اور اللہ کا ذکر خوب کرتا ہے۔''

پیشوا اور نمونہ تقلید:

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ھادی و رہنما بنایا ہے۔ یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لئے خاص ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ بیک وقت دنیائے فکر، عالم اخلاق اور جہاں عالم تینوں کا صدر انجمن ہوتا ہے۔ تینوں کے مسائل پر اس کی نظر یکساں رہتی ہے، اس میں تفکر، جذبات لطیف اور حکمت عملی تینوں کی ایک معتدل امیزش ہوتی ہے اور خدا کا رسول جو طریق فکر، جو اصول اخلاق اور اصول قانون مقرر کرتا ہے۔ وہ قومی رجحانات یا زمانی خصوصیات پر نہیں بلکہ صداقت اور حق پر مبنی ہوتے ہیں اور حق و صداقت ہی وہ شئے ہے۔ جو مغرب اور مشرق، سیاہ و سفید، قدیم اور جدید کے جملہ قیود سے بالاتر ہو جو چیز سچی اور برحق ہو وہ دنیا کے ہر گوشے دنیا کی ہر قوم اور وقت و زمانہ کی ہر گردش میں یکساں اور برحق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کی بعثت کا مقصد لوگوں کی رہنمائی اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچانا ہے وہ جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں۔ اس کے سامنے ھدایت و رہنمائی کے دو چراغ (کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ) روشن ہوتے ہیں۔ سورۃ ال عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ o قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ﴾ [ال عمران: ۳۱]

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يرجوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاخِرِ﴾ [الاحزاب: ۲۱]

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو پیشوا مقرر کیا تھا اور ان کی پیروی اور تقلید کو مسلمانوں کے لئے لازم قرار دیا ہے اپنے آخری خطبوں میں سے ایک حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے فرمایا تھا۔

انی تارکٌ فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ وسنتی

جو مسلمان آپ ﷺ کے عہد مبارک میں تھے ان کے تو سامنے ہی آپ ﷺ کی زندگی تھی، لیکن آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی زندگی سنت کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے اور قرآن کریم کے بعد ہماری ھدایت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔

آخرت:

یوم آخر سے مراد موت کے بعد کی زندگی ہے۔ اس لئے اس کو حیات اخرت اور دار آخرت بھی کہا گیا ہے یوم آخر اور حیات آخرت پر ایمان اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے اور قرآن کریم میں ایمان باللہ کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کے پہلے رکوع میں ہدایت یاب اور کامیاب انسانوں کی اخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے۔

﴿وَبِالۡاٰخِرَةِ هم یوقنون﴾[البقرہ:۲۶]

''اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔''

﴿مَنۡ اٰمَنَ باللّٰہ والیوم الآخر﴾[توبہ:۲۲]

''جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے۔''

﴿ الذین یومنون باللہ وبالیوم الاخر﴾[البقرۃ:۱]

''جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے ہیں۔''

موجودہ زندگی کے بعد حیات اخروی کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں لفظ (الیوم الاخر، والحیوۃ الاخرۃ، والدار الاخرۃ) کے ساتھ ایک سو تیرہ مقام پر بیان کیا ہے۔ کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اوران کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے۔ اگر یہ بنیاد متزلزل ہوجائے۔ تو اعمال انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ وبن سے اکھڑ جائے گا۔ اسی لئے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو متفقاً تسلیم کیا ہے۔

یہ زندگی آخرت کی امتحان گاہ ہے:

دنیا کی یہ زندگی، آخرت کے لئے امتحان ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاۃَ لِیَبْلُوَکُمْ أَیُّکُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً ۝ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ﴾ [الملک:۲]

ترجمہ: ''جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا، تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے، کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی ہے''۔

یہ دنیا آخرت کے لئے امتحان گاہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ کون ممنوعات الٰہیہ سے اپنے نفس کو باز داشت کرنے والا ہے۔ اور کون اطاعت الٰہی میں زیادہ سرگرم ہے، یعنی تخلیق موت وحیات کی حکمت یہ ہے کہ فرمانبردار اور نافرمان کا جدا جدا ظہور ہو جائے۔ یہاں کی زندگی کے بعد عمل کی مہلت ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد ایک دوسرے عالم درالجزاء ہے جہاں انسان کی دنیا میں کئے ہوئے ایک ایک عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائیگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دنیا میں بھی انسانوں کو ان کے حالات وواقعات اور اعمال وافعال کے لحاظ سے کسی درجہ میں بدلہ ملتا ہے۔ مگر پورا پورا بدلہ نہیں ملتا، اور اس کے لئے عالم آخرت مقرر ہے کہ جہاں دنیا میں کئے ہوئے عملوں کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

﴿کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُوْرَکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّۃَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَیَاۃُ الدُّنْیَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ [ال عمران:۱۸۵]

ترجمہ: ''آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دروزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دنیا، تو یہ محض ایک ظاہر فریب چیز ہے۔

یوم آخرت پر قرآنی دلیل:

قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کر کے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے۔ اول یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا ہے اگر اس کے اعمال کا مواخذہ اور جزاء وسزاء نہ ہو، تو خیر وشر اور نیکی وبدی کا فطری امتیاز لغو، اور انسانی زندگی تمام تر بے مقصد اور اس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خلقنکُمْ عَبَثًاوَّ اَنَّکُمْ اِلَیْنَا لاتُرْجَعُوْن﴾

[مومنون: ۱۱۵]

''اے لوگوں! کیا تم یہ سمجھتے ہو، کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے''۔

﴿اَیَحْسَبُ الانسان اَنْ یترك سُدًی﴾[الدھر: ۳۶]

''کیا انسان سمجھتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائیگا۔''

دوسری بات جو روز جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا عادل اور منصف ہونا ہے اگر اچھے اور برے انسانوں کے اعمال کی جزاء وسزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے گا۔ اور نیکی وبدی اور گناہ وثواب کے کوئی معنی نہ رہیں گے بلکہ نعوذ باللہ خدا ظالم اور غیر منصف قرار پائیں گے۔ لہٰذا روز جزا ضرور ہونا چاہیئے تا کہ ہر ایک کو اس کے ظلم کے بدلے سزا اور نیکی کے بدلے جزا مل جائے۔ مثلاً ایک آدمی نے سو آدمیوں کو قتل کیا ہے تو دنیا والے تو صرف اس ایک آدمی کو ایک مرتبہ قتل کر سکتے ہیں۔ لیکن خدا وہ ذات ہے جو اس کو سو قتلوں کی سزا دے سکتا ہے۔

حیات اُخروی کا انکار:

اہل عرب نے توحید کے بعد جس عقیدہ سے شدت کے ساتھ انکار تھا جس کے ماننے پر وہ کسی طرح امادہ نہیں ہوتے تھے اور جو ان کی عقل میں کس طرح نہیں سماتا تھا وہ یہی

قیامت اور حشر ونشر کا مسئلہ ہے۔ جاہلی عرب حیات بعد الممات، خدا کے آگے اپنے اعمال کے مواخذہ اور پرستش اور سزا و جزا سے قطعاً لاعلم تھے۔ اسی لئے ان کو اعمال کے خیر و شر اور نیکی و بدی میں وہ تمیز نہ تھی جس پر اخلاق و معاملات کا تمام تر دارومدار ہے اور یہی خیال آج تک پروان چڑھتا رہا، آج بھی ایک جماعت کے نزدیک زندگی جو کچھ بھی ہے یہی دنیا کی زندگی ہے اور موت کے بعد حیات شعور، احساس پھل اور نتائج کچھ بھی نہیں۔

﴿وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ﴾ [الجاثية:۲۴]

''اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس صرف اس دنیا کی ہے کہ یہی مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے۔''

﴿ءَ اذا متنا وكُنَّا تراباً ذلك رَجْعٌ بَعِيْدٌ﴾ [ق:۳]

''کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائے گے تو یہ لوٹنا بہت دور ہے۔''

﴿من يُحْيِ العِظَامَ وَهِيَ رميمٌ﴾ [یس:۷۸]

''ان گلی سڑی ھڈیوں کو کون جلائے گا۔''

ان لوگوں کو روز جزا اور قیامت پر یقین کرنے سے جو اہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں تو قیامت کے دن کیونکر جلائے جائیں گے۔ یعنی چونکہ مر کر دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا اس لئے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے لیکن نبی ﷺ نے ان لوگوں کو تاریخی مثالیں پیش کئے کہ جیسا کہ حضرت ابراہیم، حضرت عزیز علیہ السلام اور اصحاب کھف کے قصوں میں مذکور ہیں اور ان سے استدلال کیا کہ جب چند آدمی یا پرند مر کر جی سکتے ہیں تو پوری دنیا بھی مر کر جی سکتی ہے، حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا خدا نے اس کو ھست و موجود کیا پھر رفتہ رفتہ اس کو معدوم کر دے گا۔ جس نے پہلے بغیر کسی سابق مثال کے اس کارخانے کو پیدا کیا کیا وہ دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا جس نے نقش اول بنایا نقش ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ○ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ [یٰس:۷۸]

''وہ بولا کون اس سڑی کھوکھلی ہڈیوں کو جلائے گا کہہ دے وہی جس نے پہلی دفعہ ان کو بنایا۔''

غرض وحی محمدی نے ہر پہلو سے کفار کے اس استعجاب اور استبعاد کو دور کیا اور ان کو دوبارہ زندگی کا یقین دلایا۔

زندگی بعد الموت کے سوال کا تعلق ہمارے اخلاقی رویئے کے ساتھ بھی ہے کیونکہ اگر ایک شخص کا یہ خیال ہو کہ زندگی جو کچھ ہے یہی دنیاوی زندگی ہے اور اس کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے تو اس شخص کا رویہ اور اخلاق ایک طرح کا ہوگا، بنسبت اس شخص کے کہ وہ اعتقاد رکھتا ہوں کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہے جس میں زندگی کا حساب دینا ہوگا اور وہاں میرا اچھا اور برا انجام میرے یہاں کے اعمال پر منحصر ہوگا تو لازماً اس شخص کے اخلاق دوسرے سے یکسر مختلف ہونگے کیونکہ جب اخلاقی تصورات بدل جاتے ہیں اور خیر وشر کے معیار متغیر ہو جاتے ہیں تو ان کے ساتھ ساتھ ضمیر کا رخ بھی پھیر جاتا ہے۔

فلسفہ:

لفظ فلسفہ (Philosophy) یونانی لفظ سوفیا (Sophia) اور فائلو (philo) سے معرب ہے سوفیا کے معنی ہیں علم دانش، عملی سوجھ بوجھ فائلو کے معنی ہیں، عشق یا محبت، مطلب دانش مندی سے عشق ومحبت ہے۔

فلسفہ کا مبتدی پریشان ہو جاتا ہے کہ مختلف فلسفیوں نے فلسفہ کی مختلف تعریفیں پیش کی ہے کچھ نے نفسیاتی امور پر زور دیا ہے اور کچھ دیگر نے اقدار کو زیادہ اہمیت دی ہے۔

صاحب المعجم الوسیط کی نظر میں فلسفہ کی تعریف:

الفلسفه: دراسة المبادی الاولیٰ وتفسیر المعرفة تفسیرًا

عقلیاً وکانت تشمل العلوم جمیعاً. واقتصر فی ھذاالعصر علی المنطق والاخلاق وعلم الجمال وما وراء الطبعیة.

[المعجم الوسیط: ۷۰۰]

مختلف فلاسفہ کی نظر میں فلسفہ کی تعریف:

مختلف فلاسفہ نے مختصراً فلسفے کی اہم تعریفیں درج ذیل کی ہے

(1) The love of wisdom

(2) Philosophy is the name for a Subject area of Stuady

(3) Philosophy is a term to identily an individual's general apprach to life.

(4) Philosophy as a techniques to clarify the way language is used.

فلسفے کی شاخیں

فلسفہ کی چار شاخیں ہیں

(۱) حساب اور اقلیدس:

اس میں ریاضیاتی اصول سے بحث کی جاتی ہے اور اس شاخ کے اولین بانی اقلیدس اور فیثا غورث ہیں ریاضیاتی تصورات میں شاید ہی اس قدر اہم کسی اور مسئلے کو وہ شہرت نصیب ہوئی ہو جو فیثا غورثی مسئلے کے حصے میں آئی سب سے پہلے مصریوں نے یہ ھندسی مسئلہ استعمال کیا تھا۔ وہ اس تصور کی صحت کے کسی ریاضیاتی ثبوت سے واقفیت کے بغیر ہی اس کو استعمال کرتے رہے۔ فیثا غورث کو اس شان دار ریاضیاتی تصور کا واضح ثبوت پیش کرنے والا پہلا شخص قرار دیا جاتا ہے۔ [زعمائے سائنس: ۱]

منطق:

فلسفہ کی دوسری شاخ منطق ہے منطق میں دلیل اور حد کی تعریف اور شرائط سے بحث کی جاتی ہے۔

الہیات:

الہیات فلسفہ کی تیسری شاخ ہے الہیات کا موضوع خدائے پاک کی ذات وصفات ہیں یہ بھی علم کلام ہی کا حصہ ہے فلسفہ نے اس سلسلہ میں کوئی نیا علم ایجاد نہیں کیا بلکہ ان کے خیالات متکلمین کے خیالات سے جداگانہ ہے ان میں سے بعض خیالات کفر ہیں بعض بدعتیں جس طرح اعتزال ایک الگ علم نہیں بلکہ متکلمین ہی میں سے کچھ لوگوں نے اپنے باطل مذاہب الگ کر لئے ہیں، اسی پر فلاسفہ کو قیاس کر لیجئے۔

طبعیات:

فلسفہ کی چوتھی شاخ طبعیات ہے طبعیات کے بعض مباحث تو شریعت اور دین حق

سے ٹکراتے ہیں اس لئے ان پر علم کا اطلاق ہی صحیح نہیں ہے بلکہ انہیں جہل کہنا زیادہ بہتر ہے بعض مباحث میں اجسام کی صفات وخواص اوران کے تغیرات موضوع بنتے ہیں۔

یونانی دور کا فلسفہ:

قدیم یونانی تہذیب کی بنیاد مذہب پر تھی اور یہ یونانی مذہب اسی نظریہ توحید پر مبنی تھا جو ہر تہذیب میں پایا جاتا ہے۔اس زمانے میں اس مذہب کی شکل ایک سلوک کے باطنی طریقے کی تھی یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ قدیم یونانی مظاہر فطرت کی پوجا کرتے تھے ہاں ہر تہذیب میں زمانے کی تبدیلی ہوتی گئے لیکن بنیادی عقائد وہی رہے، یونانی فلاسفہ کی فکر میں طبیعاتی عنصر کی جگہ مابعد الطبعیات عنصر زیادہ گہرا اور واضح نظر آتا ہے۔مثلاً تھیلز (Thales) کا یہ نظریہ کہ ہر چیز پانی سے ہی بنی ہے۔طبیعاتی سے زیادہ مابعد الطبعیاتی ہے۔لیکن پانچویں صدی قبل مسیح جوکہ مغربی لوگوں کے نزدیک یونانی فکر کا زریں دور سمجھا جاتا ہے یہ دور سقراط اور افلاطون کا دور تھا یہاں سے یونانی فلسفے کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

سقراط:

سقراط کے ساتھ یونانی فلسفے کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے اب توجہ کا مرکز انسان بن جاتا ہے اور ہر مسئلے پر انسان کے نقطہ نظر سے غور کیا جاتا ہے سقراط نے فلسفہ کا رخ کائنات اور فطرت سے ہٹا کر انسان ہستی اور انسانی معاشرے کی طرف پھیر دیا۔

بہر حال اتنی بات واضح ہے کہ سقراط مادہ پرستی سے بری تھا وہ روح کے لافانی ہونے پر یقین رکھتا تھا اور حیات بعد الموت کا قائل تھا مذاھب کے تمام بنیادی عقائد کا قائل تھا بس فرق صرف یہ تھا کہ وہ وحی کے بجائے عقل انسانی کو اپنا رہنما بناتا تھا۔

ارسطو:

یونانی فلسفیوں کا وہ گروہ جس کا تعلق خاص ملک یونان سے ہے۔اس گروہ کے مشہور

نمائندے افلاطون اور ارسطو ہیں۔ جن کا زمانہ پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح ہے پھران یونانیوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک طرف افلاطون کے مقلد اور دوسری طرف ارسطو کے مقلد رینے گینوں کہتے ہیں ''کہ بنیادی طور پر افلاطون اور ارسطو کا نظریہ ایک ہی ہے بس فرق یہ ہے کہ افلاطون نے تنزیہی نقطہ نظر اختیار کیا اور ارسطو نے تشبیہی نقطہ نظر یہ اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ فلسفے کی اقسام کرتے ہوئے ارسطو نے سب سے پہلا درجہ مابعد الطبعیات کو دیا وہ کہتا ہے:

''علم الٰہی تو صرف خدا ہی کا حصہ ہے''

[Chpter 2 Book 1 Metaphsica by Aristotle]

طبعیات کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ یہ بھی ''ایک قسم کی حکمت ہے لیکن اس کا درجہ اولین نہیں'' ارسطو مابعد الطبعیات سے بے تعلق تو نہیں ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ یونانی فلسفے میں تین بڑی تبدیلیاں آئیں:

(۱) عالم وحدت کا اقرار تو باقی رہا، لیکن زیادہ توجہ عالم کثرت پر صرف ہونے لگی۔

(۲) عالم وحدت پر غور کرنا تھا یا عالم کثرت پر بحث کا مرکز انسان ہوتا تھا۔

(۳) علم کا ذریعہ عقل انسانی کو بنایا گیا۔

ارسطو کے بعد ان رجحانات کو اتنی ترقی ہوئی کہ یونانی فلسفہ انتشار کا شکار ہو گیا اور مابعد الطبعیات سے دور ہٹتا چلا گیا۔ [سر سید اور حالی کا نظریہ فطرت: ۱۳۹]

یونانی دور میں بلاشبہ بلند پایہ علماء و فلاسفہ پیدا ہوئے انہوں نے انسانی ذہن و دماغ کے لئے نہایت قیمتی مواد فراہم کئے یہی وجہ ہے کہ تمام پیش رو متمدن ملکوں کے علوم کا لائق وارث یونان سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ایک نا قابل بیان حقیقت ہے کہ یونان میں علم کا دائرہ سالہا سال تک چند افراد میں محدود رہا اور جب وسعت پیدا ہوئی تو علم کی جگہ ایک قسم کی ذہنی عیاشی نے لے لی اور لوگ اندھی تقلید، جمود، توہمات، خرافات کی دلدلوں میں پڑے دھنستے چلے گئے۔

یونان میں انہی توہمات اور خرافات کی پھولنے پھلنے کی وجہ سے ایسے علماء وعلم کو برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا جو اس کے دینی توہمات کا ساتھ نہ دیں۔ یہی وجہ تھی کہ یونان والوں نے سقراط جیسے بلند پایہ حکیم کو زہر کا پیالہ پلایا افلاطون جیسے بڑا فلسفی اپنے مخصوص شاگردوں کے علاوہ کسی کے سامنے اپنے علمی خیالات ظاہر نہیں کر سکتا تھا اقلس سنگ سار ہوتے ہوتے بچا ارسطو کو اس لئے وطن سے فرار ہو جانا پڑا کہ اس کا علم اس کے ہم وطنوں کے توہمات کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔

ازمنہ وسطی: عیسوی دور:

یونانیوں اور رومیوں کے بعد عیسوی دور آتا ہے جیسے آزمنہ وسطی کہا جاتا ہے یہ دور تقریباً پانچویں صدی عیسوی سے لے کر پندرھویں صدی تک ہزار سال پر پھیلا ہوا ہے اس دور میں نہ صرف افکار بلکہ معاشرتی اور سیاسی اداروں تک کی بنیاد عیسوی دین پر رکھی گئی تھی، دینی معاملات میں یورپ نے سارا اختیار سنبھال لیا تھا، عیسوی دین کا اثر دور دور تک پھیل چکا تھا۔ ازمنہ وسطی کے فلسفی، پروفیسر اور سائنس دان ساتھ ہی راہب بھی ہوا کرتے تھے۔

اس دور میں یوں تو بیسیوں مفکر گزرے ہیں لیکن مرکزی حیثیت دو آدمیوں کو حاصل ہے۔ ایک تو سینٹ آگسٹین (St. Augustine) اور دوسرے سینٹ ٹامس اکوائناس (St. Thomas Aquinas) ان میں سے پہلا مفکر اس دور کے شروع میں آتا ہے۔ یعنی چوتھی اور پانچویں صدی میں اور دوسرا مفکر اس دور کے تقریباً آخر میں یعنی تیرھویں صدی میں چودھویں صدی میں مغرب کے دینی افکار میں انتشار پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اس کے نتیجے میں جدید افکار پیدا ہوئے۔

اگسٹین کی فکر کا مرکز خدا سے قرب کا حصول تھا اس نے خود کہا ہے:

''میں خدا کی معرفت اور روح کا علم حاصل کرنا چاہتا ہوں اس کے سواء؟ اس کے سواء کچھ نہیں۔'' [سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت: ۱۴۲]

چنانچہ اس نے زیادہ تر خدا کی ذات وصفات سے بحث کی ہے۔

سینٹ ٹامس اکوائناس (St.Thomas aquinas) جس کے افکار میں از منہ وسطی کا فلسفہ اپنے عروج کو پہنچتا ہے اس کی بنیادی کوشش یہ تھی کہ ارسطو کے فلسفے کو عیسوی عقائد سے ہم اھنگ کیا جائے۔

یونانی فلسفہ اس دور میں بھی پڑھا جاتا تھا یہ لوگ فلسفے کو اپنے دین کا تابع رکھنا چاہتے تھے بارہویں صدی میں مغرب پر سب سے شدید اثر ابن رشد کا تھا۔ عیسوی دنیا کا سب سے بڑا مفکر سینٹ ٹامس اکوائناس نے تیرھویں صدی میں ابن رشد کے فلسفے کو شکست دے کر عیسوی عقائد کو ارسطو کی منطق اور فلسفے کے ذریعے ثابت کیا۔

سینٹ ٹامس ابن رشد کا خاص طور پر دشمن تھا اور ہر اس خیال کو جیسے الحاد سمجھتا، ابن رشد سے منسوب کر دیتا صرف یہی ایک شخص نہیں بلکہ پورے کلیسا نے ابن رشد کو لعن طعن کرنا اور گالیاں دینا دنیا اور دین کی سب سے بڑی خدمت سمجھ لیا تھا۔ بار بار دینی کونسلیں منعقد ہوتیں اور ابن ارشد کی تصانیف کے تراجم پڑھنے پڑھانے کو بدترین کفر قرار دیتیں۔

اس قدر نہیں سولہویں صدی عیسوی تک مذہبی تصویروں میں تمام دستور ہو گیا تھا کہ دجال اور شیطان کے ساتھ ابن رشد کی تصویر بھی ضروی بنائی جاتی تھی اور سینٹ ٹامس کی ہر تصور کے ساتھ تو ابن رشد کا ہونا ضروری سمجھ لیا گیا تھا تصویر دکھایا جاتا کہ ابن رشد چاروں شانے زمین پر چت پڑا ہے۔ اور سینٹ ٹامس اس کے سینے پر سوار ہے۔

از منہ وسطی میں یونانی فلسفے کا مسلمانوں پر اثر:

خلافت راشدہ کے کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کے ایمان اور اتفاق میں زوال کا دور اس وقت شروع ہوا جب مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کو درآمد کیا۔ اور اس کو قرآنی تعلیمات کو سمجھنے کا ذریعہ بنایا۔ چنانچہ اکثر مسلمان افلاطون اور ارسطو کے نظریات میں ایسے الجھے کہ خود اپنے عقائد کی صورت بھی بگاڑ بیٹھے کیونکہ یونانی فلسفے کی بنیاد صرف عقل پر تھا اور پھر

عباسی دور میں اس باطل کی فکری یلغار نے مستقل ایک تحریک کی شکل اختیار کی کیوں کہ دور بنوامیہ سے علوم یونان اور فلسفہ ھند وغیرہ کے جو عربی تراجم شروع ہوئے تھے۔اس میں تیزی آئی اور لوگ ''شریعیات''یعنی علوم نقلیہ شرعیہ کی بنسبت ''علوم عقیہ'' کی طرف زیادہ متوجہ ہونے لگے'' مامون الرشید نے اس میں ضرورت سے زیادہ ہی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور باقاعدہ یونان کے بادشاہوں سے کتابیں منگوا کر اس کی عربی ترجم کروائے تراجم کرنے والوں کو معاوضات دیئے یہاں تک کہ مامون خود ہی عقلیات سے متاثر ہوکر اعتزال کی طرف مائل ہوگیا اور معتزلہ کو گویا سرکاری تعاون حاصل ہوگئی۔

مامون الرشید کی سرپرستی میں معتزلہ ایک بے کار مبحث میں الجھ گئے کہ'' قرآن مخلوق ہے اور اس کلامی مسئلے کو معتزلہ نے الہامی عقیدہ بنادیا اور ہر وہ شخص جو ان کے اس عقیدے کے خلاف کرتا گمراہ اور کافر قرار دے کہ ریاست کی طاقت سے مخالفانہ نقطہ نظر رکھنے والوں کو کچلنے، دبانے اور نیا نظریہ تبدیل کرنے پر مجبور کیا اور ساتھ ساتھ خلیفہ مامون رشید نے ان تمام لوگوں پر سرکاری ملازمتوں کی دروازے بند کردیئے جو مخلوق قرآن کے قائل نہ تھے۔

چودہویں صدی اور ابن رشد:

سینٹ ٹامس اکوائناس نے عیسوی مذہب کو ارسطو کے فلسفے پر اس طرح قائم کیا تھا۔کہ ارسطو عیسوی مذہب کا لازمی جزء بن گیا تھا۔ایسا معلوم ہونے لگا کہ ارسطو کا انکار عیسوی مذہب کا انکار ہے لیکن دین اور ارسطو کے عقلی فلسفے کا یہ توازن سو سال بھی قائم نہیں رہ سکا اور چودھویں صدی میں بعض لوگوں نے ابن رشد کی پیروی پھر سے شروع کردی اور فلسفی دو گروپوں میں تقسیم ہونے لگے۔ایک طرف حقیقت پرست (Realists) جو کہتے تھے کہ حقیقت بس عالم روحانی میں ہی ہے۔عالم مادی تو بس سایہ ہے دوسری طرف ''اسم پرست'' (Nominalism) تھے۔(اسم پرست تحریک کا خاص مرکز انگلستان کی اکسفورڈ یونورسٹی اور نمائندہ شخصیت انگریز فلسفی ولیم آف اوکھم (William of

ockham) تھا۔

جو کہتے تھے کہ عالم روحانی بھی حقیقی ہے اور عالم مادی بھی اس لئے پہلے گروہ والے انہیں طنزاً اسم پرست کہتے تھے۔ یعنی یہ لوگ محض نام کے پیچھے چل پڑے ہیں اور حقیقت سے سروکار نہیں رکھتے۔

اسم پرستی کی اس تحریک نے عالم مادی اور عالم روحانی کو یکساں حقیقی سمجھ کر اور دین و عقل کو الگ الگ دائروں میں بانٹ کر کے ثنویت کی بنیاد ڈال دی جو سترھویں صدی میں ڈیکارٹ کے فلسفے اور اٹھارھویں صدی میں مادہ پرستی کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئی۔

نشاۃ ثانیہ: ہیومن ازم کے فلسفے کی ترقی:

سقراط جس نے یونانی فلسفے میں انسان کو ایک مرکزی مقام عطاء کیا تھا اور ہر مسئلے پر انسان کے نقطہ نظر سے غور کیا جاتا تھا۔ پندرھویں صدی میں اس فلسفے کو نمایاں مقام حاصل رہا۔ یونانی علوم ازمنہ وسطیٰ میں بھی رائج تھے مگر انہیں ثانوی حیثیت دی جاتی تھی سب سے بڑا درجہ دینی علوم کا تھا لیکن پندرھویں صدی میں دوبارہ یونانی علوم کو اونچی جگہ دی گئی یہ علوم وحی پر مبنی نہیں تھے۔ بلکہ عقلی تھے دوسرے یونانی علوم میں ہر مسئلے پر انسانی نقطہ نظر سے غور کیا جاتا تھا اور انسان ہی کو کائنات کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

نشاۃ ثانیہ کا اصل مطلب ہے کہ نقل پر عقل کو ترجیح دینا اور عقلیت اور انسان پرستی اختیار کرنا اس لئے اس تحریک کا دوسرا نام انسان پرستی۔ (Humanism) بھی ہے۔

انسان پرستی (Humanism) کیا ہے:

Humanism is any Philosophy which recognizes the value or dignity fo man and makes him the measure of All Things or some how takes human nature its limits or its intrest as its Theme(جریدہ: ۳۵/۲۵۶)

ھیومنزم ہر اس فلسفے کو بھی کہتے ہیں جو انسانی قدر یا عزت کو تسلیم کرے اور اسے تمام چیزوں کا میزان قرار دے یا جو صرف انسانی طبیعت کو اپنی فکر کی حد یا دائرہ کار کی حیثیت سے لے۔

> Humanism in philosophy is opposed to naturalism and absolutism. it dogmatizes The Philosophical attitude which regards the interpretation of human experience as the primary concern of All philosophizing and asserts the adequacy of human knowledge for this purpose.
>
> [Encyclopeadia of Religion and Ethies]

ترجمہ: ''فلسفے میں ہیومنزم ہر طرح کی فطریت اور کلیت کی ضد ہے۔ یہ ایک ایسا فسلفانہ رجحان دیتا ہے جو انسانی تجربوں کی تشریحات تو ہر طرح کے فلسفے کا اولین مرکز توجہ قرار دے اور اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ اس کام کیلئے انسانی علم کافی ہے۔

نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے دور میں لوگوں کے دلوں میں مذہبی جوش وجذبہ کم ہوتا چلا گیا۔ لیکن مذہب کی رمق ابھی تک باقی تھی اس نے عموماً خدا کے وجود سے انکار نہیں کیا گیا لیکن خدا پر ایمان ایک رسمی چیز بن گیا اس کے ساتھ ساتھ اخرت سے بھی انکار نہیں کیا گیا لیکن اخرت کی طرح دنیا کو بھی حقیقی سمجھا جانے لگا۔

اس دور میں فطرت کا روایتی تصور اگر چہ لوگوں کے ذہن میں قائم تھا لیکن رفتہ رفتہ تجربی سائنس، ہر چیز میں باریک بینی اور ہر نظریے کو کانٹ چھانٹ کر کے اس کو روکھے اور جزوی انداز میں پیش کرنا شروع کیا لیکن سولہویں صدی کے سائنس دان تک جس پر کوپرنیکس (Copernicus) شامل ہے۔ یہ نظریہ رائج تھا کہ کائنات اور قدرت کے نظام میں ایک طرح وحدت موجود ہے بدقسمتی سے ڈیکارٹ اور اس کے مداحون نے جو

سائنس اور فلسفہ کا سلسلہ چلا رکھا تھا اس نے کائنات کو ایک میکانکی نظام تصور کیا جس کے نتیجے میں سولہویں سے سترھویں صدی تک جو ذھنی انقلاب برپا ہوا اس نے تمام روایتی اندازِ فکر کو ختم کر کے رکھ دیا ستاروں اور سیاروں کی دریافتیں ہوتی گئی اور فطرت کا مسلمہ نظریہ درہم برہم ہوتا گیا۔ اعداد وشمار اور حساب دانی نے تفصیلات میں جانے کا رجحان ایسے چلایا کہ لوگ اگر جزو کی طرف دیکھنے لگے تو کل کو نظر انداز کر گئے۔

سترھویں صدی اور مابعد الطبیعات:

سولہویں صدی تک چونکہ یونانی فلسفے کو تفوق حاصل تھا اور علم مابعد الطبیعات سے حاصل ہوتا تھا یعنی پہلے مابعد الطبعات (Metaphysics) بعد میں علم آتا تھا کیونکہ ارسطو کے مشاھداتی تجزیات کے طریقے سے مابعد الطبیعات کو منہا کر کے کوئی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا ہے۔ تمام قدیم تہذیبیں اپنے تمام امور، علوم، شعبہ ہائے زندگی اور طور طریقے مابعد الطبعیات سے حاصل شدہ علمیت کی روشنی میں انجام دیتے تھے۔ تقریباً سترھویں صدی تک چیزوں یعنی پانی، ہوا، مٹی، خدا کی حقیقت موجود تھی لیکن جب سترھویں صدی میں لادینیت کا دور شروع ہوا سائنس کی دریافتیں اور قدیم علم حساب، اقلیدس طب اور دیگر علوم کو از سر نو رائج کیا گیا تو ان علوم کے مابعد الطبعیاتی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا گیا یہاں تک کہ پوسٹ ماڈرنسٹ مفکرین (Post Modrenist)

(Philosophers) نے یہ کہہ دیا کہ تمام مباحث کا تعلق میرے وجود (Being) سے ہے۔ میں کہاں سے آیا تھا؟ اور کہاں جاؤں گا؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا Being سے اور میری (Existence) وجود سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ میں نہیں تھا دنیا میں آنے سے پہلے اور مرنے کے بعد کہاں ہوں گا یہ دونوں سوالات بے کار ہیں کیونکہ دنیا کو آنے سے پہلے میں نہیں تھا اور دنیا سے جانے کے بعد نہیں ہوں گا۔ لہذا ان سوالات کے جوابات پر غور وفکر کرنا بے کار ہے۔

جدید فلسفے کا بانی ڈیکارٹ:

ڈیکارٹ کو جدید فلسفے کا بانی کہا جاتا ہے جو ایک کیتھولک عیسائی تھا اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں کے شکوک وشبہات دور کر کے دین کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن نتیجہ الٹا نکلا مغرب کے ذہن کو مسخ کرنے کی ذمہ داری جتنی اس پر ہے شاید ہی اتنی کسی اور پر ہو اس نے مابعد الطبیعات کی اساس شک پر رکھی اور ہر اس چیز کو علم کی دائرے سے باہر نکال دیا جس پر شک کیا جا سکتا تھا اور جس پر شک نہ کیا جا سکے اس پر علم کی عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے لہذا خدا کے وجود کے بارے میں شک کیا جا سکتا تھا کہ کیا خدا موجود ہے؟ کیا وہ خالق ہے؟ لہذا خدا کی حقیقت کا انکار کر دیا تاریخ فلسفہ کا مشہور ترین جملہ فلسفے میں آج بھی اس کی ذہانت کا کمال تصور کیا جا سکتا ہے۔

" I Think There fore I am "

میں سوچتا ہوں "اس لئے کہ میں ہوں" تاریخ فلسفہ میں ڈیکارٹ وہ پہلا فلسفی ہے جس نے اس جملے کے ذریعے وجود انسانی کے سواء ہر وجود کو نا قابل اعتبار ٹھہرا کر مابعد الطبیعاتی سوالات کو فلسفے کی اقلیم سے خارج کرنے کا فریضہ انجام دیا جس کا حتمی نتیجہ بیسویں صدی میں سامنے آیا۔ جب پوسٹ ماڈرن ازم نے سو سال تک فلسفہ میں زیر بحث آنے والے وہ تین سوالات جن کا تعلق

"Metaphysics, Epistemology, Axiloghy"

سے تھا لایعنی قرار دے کر فلسفے کی تاریخ بدل ڈالی وہ سوالات جو فلسفے میں خیر وشر کے معیارات کے فلسفے سے متعلق تھے اور تعینات میں کلیدی کردار کے حیثیت رکھتے تھے۔ پچیس سو سال تک اس کے بغیر فلسفے کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا، پس جدیدیت

Post modern (Philosophy)

نے ان سوالات کو لایعنی مہمل اور فضول قرار دیا۔ وہ سوالات یہ ہیں:

حقیقت کیا ہے؟ (1) What is real?

حقیقت ہم کیسے پہچان سکتے ہیں؟ (2) How do we know ?

خیر کیا ہے؟ (3) What is a good,right or beautiful?

ڈیکارٹ نے انسان اور اس کے فکر کے سواء ہر وجود کو قابل شک بنایا صرف Thinking of the thinker پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ ڈیکارٹ نے یہ بھی بتایا کہ Where ever you go there you are۔ اس کے ساتھ اس نے وجود خداوندی کے دلائل بھی دیئے تاکہ کلیسا ناراض نہ ہو اور اس کے جدید فلسفے کے تناظر میں پہلی مرتبہ ایک ایسی تہذیب وجود پذیر ہوئی جس نے مابعد الطبیعاتی سوالات کا انکار کیا۔

French philosopher rene Descartes(1596-1650)is often celled the Father of Modern philosophy. He started out his career as a mathematician and is credited with discovering the concept of Analytic Geometry. He also was a physicist of great repute. Descartes was a faithful Catholic, but he privately knew the Church was wrong headed in its resistance to and persecution of men of science He knew that these men and their philosophies were the way of the future, and if the Church did not adapt, it would suffer as aresult.

Doubt Everything

Descartes sought nothing less than the formidable task of a radically revisionist look at knowledge.He started with the premise of duubt He decided to doubt

every thing.

He believed that everything that he knew, or believed he knew, came from his senses, and sensory experience is inherently suspect. This is the classic Skeptc starting point.[Chapter No.8 "The Scientific Revolution" in Essential Philosophy.70,71 David & Charles USA 2006]

سترھویں صدی کے بعد یونانی فلسفے کی جگہ مغربی فلسفہ:

سترھویں صدی میں انسانی ذہن اور انسانی زندگی میں ایک بنیادی انقلاب برپا ہوا تھا اسی انقلاب کے نتیجے انسان اپنے سے پہلے والے انسان سے ہر علاقہ منقطع کرنے پر مصر تھا، علم حاصل کرنے کیلئے فطری اور تجرباتی طریقہ ہی صحیح طریقہ قرار دے کر عقلی مابعد الطبعیاتی طریقہ سے انکار کیا گیا تھا، لیکن ساتھ ساتھ اس صدی کا انسان تقریباً نصف صدی تک خداوحی اور دیگر مافوق الفطرت چیزوں سے کامل طور پر منکر نہیں ہو چکا تھا۔

خداپرستی اور نیچریت(Naturalism) دونوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں اسی طرح سائنس نے بھی اس وقت تک کامل الحاد کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا ، کوپرنیکس (Copernicus) گیلیلو (Galilo) کپلر (Kepler) نیوٹن اور سائنس کے دوسرے علمبرداروں میں کوئی بھی خدا کا منکر نہ تھا، لیکن بعد میں چند ایسے ازادخیال فلاسفر اور حکماء پیدا ہوئے جنہوں نے یا تو علانیہ خدا کے وجود سے انکار کر دیا یا صرف خدا کو دستوری فرمان روا(Constitutional Moharch) سمجھا جانے لگا۔ان آزاد خیال مفکرین میں ایک مفکر اور فلسفی عمانیول کانٹ ہے۔

عمانیول کانٹ:(IMMANUEL KANT)

عمانیول کانٹ جرمنی کا مشہور فلسفی گزرا ہے، کانٹ کی پیدائش ۱۷۲۴ء اور اس

کا انتقال ۱۸۰۴ء میں ہوا۔ کانٹ مغربی فلسفے میں بنیادی حیثیت کا فلسفی ہے۔ مغربی فکر پر جتنا گہرا اور دیرپا اثر کانٹ نے ڈالا ہے افلاطون کے بعد شاید ہی کسی نے ڈالا ہو، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ تم حقیقت نہیں پہچان سکتے ہو اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن اور پیغمبر کو بھیجا تا کہ وحی کے ذریعے وہ متعین کر سکے کہ حقیقت کیا ہے؟ لیکن کانٹ نے کہا کہ حقیقت کو ہم پہچان نہیں سکتے ہیں البتہ ہم اپنے عقل اور تجربے سے حقیقت بنانے کی کوشش کریں گے۔

کانٹ کا کوپرنیکی انقلاب:

تقریباً پندرھویں صدی تک فلسفہ، سائنس اور عیسوی مذہب کا اجماع تھا کہ زمین ساکن ہے لیکن جب کوپرنیکس کی کتاب ''سیاروں کی گردش'' The revolution of Celestial spheres منظر عام پر آتی جس میں کوپرنیکس نے یونانی سائنس کا یہ فلسفہ کہ ''زمین ساکن ہے'' علماً اور عملاً غلط ثابت کر دیا اور پہلی مرتبہ یہ بتایا کہ اجسام سماوی زمین کے گرد گردش نہیں کرتے بلکہ زمین اور دوسرے سیارے سورج کے گرد گردش کرتے ہیں اس کو کوپرنیکی انقلاب (Copernicus Revolution) کہا جاتا ہے۔

اس کے مقابل لیکن کانٹ نے کہا کہ Self یعنی انسانی ذات کے اندر ہی ایسا نظام اور ترتیب موجود ہے جو انسانی تجربے کو ہیئت (From) اور ساخت (Structure) فراہم کرتا ہے اور نتیجتاً انسانی تجربے کو بحیثیت تجربہ کے ممکن بناتا ہے، ذات یا (Self) کے اس اندرونی نظام کے بغیر تجربہ ممکن نہیں ہوگا گویا ہمارا علم اشیاء کے گرد نہیں گھومتا ہے بلکہ علم اشیاء کا محور خود انسان ہے تمام علم حقیقت میں انسان کے گرد گھومتا ہے اور صرف ظاہراً اشیاء کے گرد گھومتا نظر آتا ہے اس مماثلت کی بنیاد پر کانٹ کے انقلاب کو کوپرنیکی انقلاب کہا جاتا ہے۔

مذہب انسان پرستی اور کانٹ:

عموماً مابعد الطبعیات ان حقائق سے بحث کرتی ہے، جو ادارک انسانی حواس اور

طبیعات عالم سے ماوراء ہے روایتی طور پر مابعد الطبعیات کا موضوع خدا، کائنات اور روح رہا ہے، لیکن کانٹ نے پہلی مرتبہ اسی فکر کو تبدیل کر کے انسان کو محور کائنات قرار دے کر نئے مذہب نئی مابعد الطبعیات کی بنیاد ڈالی جسے ہم آج مذہب انسان پرستی Religion of Human worship سے پہچانتے ہیں۔

کانٹ اس بات کا قائل تھا کہ انسان کو آزاد اور خود مختار ہونا چاہیے انسان کی عقل کل ہونی چاہیے اس نظریے کے پیش نظر اس نے ہر اس روایتی اور مذہبی مابعد الطبعیات کا انکار اور رد کیا جو انسانی خود مختاری کا سودا کرتی ہے۔ ارادہ انسانی کی تحدید اور عقل کل ہونے کی نفی کرتا ہے انسان کو خود اپنی اتباع کرنی چاہیے وہ خود مختار ہے اور اپنے اختیار میں کسی کے سامنے دستبردار نہ ہو، یہ دستبرداری اس کی خود مختاری کے منافی ہے وہ خود خدا ہے، خود خیر وشر کا ماخذ ہے اس نظریہ کے تحت کانٹ نے کہا تھا کہ سب سے ذلیل انسان وہ ہے جو اپنے نفس کے سواء اور کے سامنے سر جھکائے خواہ وہ خدا ہی کیوں نہ ہو۔

الغرض کانٹ سے پہلے تمام فلسفیوں کو مابعد الطبعیاتی تناظر میں کسی حقیقت علیا کی تلاش اور جستجو رہی ہے لیکن کانٹ نے پہلی بار یہ اعلان کیا کہ فلسفہ کا مقصد سچائی نہیں بلکہ انسانی مفادات کا تحفظ ہے اس کے نزدیک کسی چیز کی خیر وشر، حق وباطل اور صحیح وغلط ہونے کا معیار صرف اور صرف انسان کا فائدہ اور نقصان ہے اگر کوئی چیز انسان کے لئے فائدہ مند ہے وہ حق، صحیح اور خیر ہے اور جو چیز انسان کے لئے نقصان ہے وہ باطل، شر اور غلط ہے۔ اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ خدا کیا کہتا ہے خدا کچھ کہے لیکن معیار صرف افادیت پرستی ہوگی۔

اٹھارہویں صدی اور تحریک تنویر ورومانیت:

اٹھارہویں صدی میں لوگوں نے عالم طبیعت اور مادے کے سواء ہر چیز کا انکار کر دیا، کائنات کے نئے نظریوں کی بنیاد علم حساب، اقلیدس، طبیعات اور دیگر سائنسی دریافتوں پر رکھی گئی یہ انسان کی مادہ پرستی کی طرف رغبت کا آغاز تھا اور لوگ خدا، مذہب، وحی اور

روحانی معاملات سے فرار کا راستہ اختیار کرنے لگے، اخلاقیات پر زور بڑھتا گیا اور مابعد الطبیعیات ختم ہو گئے، اسی طرح عقل کو ایک آسمانی ملکہ سمجھا جانے لگا، عقل کی آواز کو خدا کی آواز کہا گیا اور رفتہ رفتہ لوگ راسخ الاعتقادی سے دور ہوتے گئے، اس صدی میں چیزوں کی مابعد الطبیعات ختم ہو کر حقیقت صرف انہیں چیزوں کی تھی جو ہمارے مشاھدے و تجربے میں آتی ہیں اور جو چیز مشاہدہ نہ کی جا سکے اور حسی تجربے میں نہ آ سکے وہ حقیقی نہیں۔

اسی صدی میں تحریک تنویر (Enlightenment) اور تحریک رومانیت (Romanticism) وجود میں آئی، تحریک تنویر اور تحریک رومانیت مغربی تہذیب کی روح رواں ہیں مغربی تہذیب کے بنیادی عقائد، تصورات اور نظریات ان ہی دو تحریکوں کی مرہون منت ہیں۔

(ا) تحریک تنویر: (Enlightment movement)

تحریک تنویر کا مطلب یہ ہے کہ عقل استقرائی (Inductive Reason) اور عقل استخراجی (Deductiue Reason) کے ذریعے حقیقت تک رسائی ہو سکتی ہے، اس تحریک کی ایمانیات، اساسیات اور اعتقادات کے مطابق انسان ہی عقل کل ہے اور حقیقت مطلق (Absolute Reality) خود وجود انسانی ہے لہٰذا وحی اور حجیت اجماع کو رد کر کے خود انسانی عقل کو تعبیر و تفسیر کا واحد ذریعہ قرار دیا اور ہر ماورائی علم کا انکار کر دیا اور انسانی عقل عقل کل ہونے کی حیثیت سے تمام مابعد الطبیعاتی سوالات کہ انسان کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کہاں جائے گا؟ کے لئے شافی و کافی ہے۔

تحریک درومانیت: (Romantic movement)

تحریک رومانیت میں حقیقت کو پہنچنے کا ذریعہ وجدان (intuition) ہے اور عقل خواہشات کی نوکر ہے (Reason is the slave of Desire) اس کا مطلب یہ ہے کہ وجدان کے ذریعے چیزوں کی حقیقت کو براہِ راست دیکھ سکتے ہوں اور

خودانسان کے اندر وہ جبلتیں ہیں جس کے ذریعے وہ (ontological Reality) تک پہنچ سکتا ہے۔

آزادی اور خودمختاری تحریک تنویر ورومانیت کی اساسیات:

آزادی (Freedom) اور خودمختاری (Autonomy) تحریک تنویر اور رومانیت کی مشترکہ میراث ہیں یعنی یہ خیال کہ انسان زندگی کے ہر شعبے میں مکمل طور پر آزاد ہے اور دوسرے کا محتاج نہیں اور مغربی تہذیب میں انسان کے قائم بالذات ہونے کا یہی تصور ہے اور یہی پوری جدیدیت کی اصل روح ہے مذہب ہو یا اخلاقیات، یا معاشرتی زندگی ہر جگہ اخری معیار فرد اور اس کے تجربے کو سمجھا گیا، دین میں فرد کی خود مختاری اور آزادی کا اصول قائم ہوگیا تو مغرب میں گمراہیاں بڑھتی ہی چلی گئیں کیونکہ ان لوگوں نے حقیقت کو جاننے کا واحد ذریعہ حواس حسی، عقلی اور عملی تجربہ قرار دیا اور روحانی اور دیگر ماورائی محسوسات کا انکار کر دیا اس لئے اٹھارہویں صدی کی عقلی دینیات (Rationalist thoedogy) سے صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا بجز اس گھڑی ساز کے کچھ نہیں جس نے اوّل گھڑی بنائی اور اور پھر اس تخلیق سے لاتعلق ہوگیا۔

انیسویں صدی:

انیسویں صدی کو اگر مادیت کی صدی کہا جائے تو بے جانہ ہوگا مغرب میں انیسویں صدی میں معیشت کا انحصار زراعت سے ہٹ کر صنعت اور کارخانہ داری پر ہوگیا تھا عقلیت پرستی کی اصطلاح باقی تھی لیکن زور اس بات پر دیا جانے لگا کہ حقیقت صرف مشاھدے اور تجربے کے ذریعے دریافت ہوسکتی ہے۔ لہذا عقل سے بھی زیادہ سائنس کی پرستش ہونے لگی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک نیا ذہنی رویہ نمودار ہوا جسے سائنس پرستی (Scientism) کہتے ہیں۔

اس صدی میں لوگ مذہبی حقیقت کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتے تھے جب تک سائنس اس کی تصدیق نہیں کرتی تھی بعض فلسفی اور سائنسدانوں نے اس نظریہ اور طریق

فکر کی تجربیت (Empiricism) سے زبردست تائید کی اور معقولات کی صحت کے لئے بھی تجربے ہی کو معیار قرار دینے پر زور دیا۔

ثبوتیت عمرانیات کا بانی کومٹ کا فلسفہ:

انیسویں صدی میں فرانسیسی مفکر کومٹ (Comte) جو کہ عمرانیات (Sociology) اور فلسفہ ثبوتیت (Positivism) کا بانی ہے، نے یہ نظریہ پیش کیا کہ جو چیز حواس اور حسیات کے ذریعے ادارک میں نہ آسکے اس کو حقیقت نہیں کہا جا سکتا ہے بلکہ حقیقت وہ ہے جو حسی تجربے اور مشاھدے میں آسکے، یہ رجحان اگر چہ پہلے موجود تھا لیکن کومٹ نے اس کو باقاعدہ ایک فلسفے کی شکل دے دی۔

لہٰذا اس نظریے کے تحت تمام ماورائے محسوسات اور مشاھدات چیزیں، مثلاً خدا، معجزہ، روح نکل گئے۔ کومٹ کے اس فلسفے کے تناظر میں تمام مذہبی عقائد اور مذہبی رسوم کو عمرانی عوامل اور مظاہر میں شمار کیا گیا اور ہر مذہبی چیز کی تشریح عمرانی نقطہ نظر سے کی گئی۔

عبادات کا رواج ورسوم میں تبدیلی:

انیسویں صدی میں عقائد کے بگاڑ کے بعد مذہبی مقدس عبادات رسوم و رواج میں تبدیل ہونے لگے کیونکہ جس طرح پروٹسنٹ ذھنیت نے کیتھولک عبادات ترک کردی تھیں تو انیسویں صدی میں بھی یہ پروٹسنٹ ذھنیت کام کر رہی تھی تو لوگوں کے خلوص کا نام عبادات رکھ دیا، کہ پس خاص شکلوں میں خدا کی عبادت کی کوئی ضرورت نہیں اور اس خلوص کو لوگ اصلی مذہب سمجھنے لگے اور اس کا دوسرا نام جذبات پرستی رکھ لیا تھا اور ایک ''جعلی مذہبیت'' رائج ہو گئی تھی۔

بیسوی صدی اور مغربی فلسفہ:

بیسویں صدی اہم ہونے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ (Complex) بھی ہے۔ اس صدی میں جدید سائنس اور جدید فلسفے نے وہ کرشمات دکھائے جو کہ انسان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھے، سائنسی تعمیر وترقی نے جدت طرازی کے بام ثریا کو چھولیا، مغرب نے اس

دور میں موٹر، ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، مصنوعی سیارے اور اس قبیل کی اور مختلف چیزیں ایجاد کر کے اپنے مادی طاقت کا مظاہرہ کیا، علم فلکیات، طبیعیات اور حیاتیات میں انیسویں صدی میں غیر معمولی ترقی کی وجہ سے اس صدی کی مادیت اور دھریت کو زبردست تقویت پہنچی، سیکولرزم، ماڈرنزم، فریڈم (Freedom) مساوات، پروگریس (Progress) ڈیولپمنٹ اور فریڈم اف اکسپریشن (Freedom of Expression) جیسے مغربی افکار ہی معتبر و مقصد ٹھہرائے گئے، جو درحقیقت انکار خدا، وحی، رسول اور انسان کی الوہیت پر مبنی ہیں، اس وقت اہل مغرب کا صرف ایک ہی نعرہ ہے۔ لا الہ الا الانسان.

یہ دور نہ محض عقلی ہے اور نہ محض سائنسی، نہ محض اشتراکیت کا نہ محض بے دینی کا اس دور کی حقیقت یہ ہے کہ سارے رجحانات اور سارے افکار اپنے تضاد کے باوجود بیک وقت موجود ہیں اور اس کے اندر کسی قسم کی درجہ بندی نہیں ہے۔

ولیم جیمز اور جان ڈیوی کے فلسفے:

بیسویں صدی کے فلسفیوں میں سب سے پہلے دو امریکی فلسفیوں ولیم جیمز اور جان ڈیوی کا نام آتا ہے، ان کے فلسفے کو "عملیت" (Pragmatism) کہتے ہیں۔

یہ دونوں فلسفی بھی کانٹ کے اس نظریئے کے حامی ہیں جس میں اس نے کہا تھا کہ کسی چیز کا صحیح اور غلط ہونا افادیت پر مبنی ہے کہ اگر وہ انسانی زندگی کے لئے فائدہ مند اور سود مند ہو تو صحیح اور اگر نقصان دہ اور ضرررساں ہو تو غلط ان دونوں فلسفیوں کا بھی یہ خیال ہے کہ کوئی خیال یا نظر بذات خود صحیح یا غلط نہیں ہوتا بلکہ ہر خیال کے قدر و قیمت کا فیصلہ اس لحاظ سے ہونا چاہیے کہ عملی یعنی مادی زندگی میں اس کے اثرات اور نتائج کیا ہوں گے یہ فلسفہ دراصل فکر کا خاتمہ ہے کیونکہ اس میں مابعد الطبیعیات اور حقائق اشیاء کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے، کیونکہ پرانے زمانے میں جس چیز کو فلسفہ کہا جاتا تھا ان دونوں فلسفیوں نے اس فلسفے کا اختتام کیا، ولیم جیمز سائنس دان بھی تھا اور فلسفی بھی ولیم جیمز نے عقل (جزوی) کے مقابلے میں "تحت الشعور" نکالا اور مذہبی عقائد اور عبادات کو غیر اصلی قرار دے کر

جذبات اور مکاشفات کو اصلی درجہ دیا۔

وٹگنسٹائن اور ھائڈیگر اور مابعد الطبیعیاتی سوالات کا جواب:

وٹگنسٹائن (Wittgenstein) نے بیسویں صدی میں یہ نظریہ پیش کیا کہ عقل کے ذریعے (Ontological) حقائق کا ادراک نہیں کیا جا سکتا ہے اس نے اس نظریے کا اظہار اس جملے سے کیا: (Metaphysics is ontolgical unsay able) حقائق کو آپ بیان نہیں کر سکتے، لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا خود کوئی حقیقت نہیں، دنیا کے اندر نہ حق ہے نہ قدر ہے اگر کہیں حق ہے اور اگر کہیں قدر ہے تو وہ دنیا کے باہر ہے، اور دنیا کے اندر حق تک رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ آفاقیت اور حقیقت تک پہنچنا بہت ضروری اور اہم ہے اور عقل کے ذریعے ہم آفاقی حقائق تک نہیں پہنچ سکتے، آفاقی حقائق کو پہچاننے کے لئے عقل سے اوپر اٹھنا چاہیے، لیکن جب یہ سوال کیا جائے کہ عقل سے اوپر کس طرح اٹھا جائے تو اس کے بارے میں وہ خاموش ہے وہ کہتا ہے کہ اس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اور ان معنوں میں اس میں اور ھائیڈیگر (Heideger) جو بیسویں صدی کا ایک اہم فلسفی ہے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔

ھائیڈیگر (Heideger) کا بھی یہی خیال ہے وہ کہتا ہے کہ انسان محض دنیا میں پھینک دیا گیا ہے۔ He has been thrown in the world لیکن دنیا میں اپنے آپ کو پانے کے بعد اس بات پر مجبور ہے کہ وہ ان سوالات کے جوابات تلاش کرے کہ انسان کہاں سے آیا؟ اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ لیکن اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہے لیکن معنی خیز زندگی گزارنے کے لئے ان سوالات کے جواب اس کو مستقل تلاش کرنا چاہیے۔

ھائیڈیگر کے نزدیک زندگی کو معنیٰ خیز (valuable) بنانے کے لئے ان سوالات کا جواب آپ کو مستقل تلاش کرنا ضروری ہے، لیکن جب یہ سوال کیا جائے کہ موت

کو کیسے معنی خیز بنائے تو ھائیڈ یگر کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ھائیڈ یگر اس معاملے میں اس طرح خاموش ہے جس طرح وٹگنسٹائن ان سوالوں کے بارے میں خاموش ہے کہ قدر اور خیر دنیا سے باہر ہے لیکن اس کو پہنچ کیسے ہوگی، سچائی دنیا سے باہر ہے لیکن ہم سچائی کو کیسے پہنچ جائیں وہ اس بارے میں بالکل خاموش ہے۔

سارتر کا فلسفہ انسان خالق اور خالق کائنات بھی:

سارتر بیسویں صدی کا ایک اہم مفکر ہے سارتر کے مطابق نفس یا ذات (Self) بذات خود کوئی چیز نہیں بلکہ Self کو (Create) کرنا پڑتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خالق ہے (The self has to be Self Created) خود اپنے آپ کو تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی طاقت ہے کہ وہ کائنات کو تخلیق کرے۔ سارتر صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ انسان خدا بن جائے لیکن خدا بننے کا عمل کیا ہے؟ تو سارتر کے نزدیک اپنی خواہشات کی تکمیل اور آزادی کی تخلیق کے لئے بھرپور کوشش کرنے کا نام خدا بننے کا عمل ہے لیکن سارتر کے اس فلسفے کو اس کے ایک دوست نے اس بات سے رد کر دیا کہ سارتر کے مطابق انسان کے خدا بننے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خواہشات کو جیسے چاہے حاصل کرے لیکن ان چیزوں کی تخلیقیت کی ایک حد ہے اور وہ موت ہے لہذا ایک انسان جس کی انتہاء بھی ہے اور ابتداء بھی وہ کیسے خدا بن سکتا ہے جبکہ خدا تو وہ ہے جس کی نہ کوئی ابتداء ہے اور نہ انتہا اور نہ اس کے لئے موت ہے۔

فوکالٹ کا فلسفہ:

فوکالٹ بیسویں صدی کے دوسرے آخر کا بہت اہم فلسفی ہے اس نے مغربی تہذیب کا مطالعہ کیا تا کہ وہ معلوم کر سکے کہ مغربی اقدار کی جو تاریخی جڑیں ہیں (Historical Root) وہ کیا ہیں؟ کہاں سے وہ تصورات نکلے ہیں۔ جن تصورات کی بنیاد پر آج مغربی تہذیب اپنی توجیہہ (Justification) پیش کرتی ہے۔ اس مطالعے کی بنیاد پر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسے قوانین جو آفاقی ہوں وہ کسی خاص تہذیب کے مطالعے سے

یا کسی خاص (Ideology) کو واضح کرنے سے نہیں نکلتے اور کہا آفاقی قوانین کو derive نہیں کیا جا سکتا۔

فوکالٹ کے نزدیک ان معنوں میں مغربی تہذیب صرف خدا کی موت ہی کا اعلان نہیں کرتی بلکہ یہ تہذیب انسان کی موت کا بھی اعلان کرتی ہے۔

This is not only the death of God but also
The death of man

چنانچہ ان کے نزدیک تجربات سے آفاقی قوانین کو اخذ نہیں کیا جا سکتا جس کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکے کہ انسانی زندگی گزارنے کا جو طریقہ ہے وہ یہ طریقہ ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ علم معاشرتی بنیادوں پر تشکیل کردہ ہے اور علم کو جو لوگ معاشرتی بنیادوں پر تشکیل دیتے ہیں ان کا اس کے پیچھے ایک خاص مقصد ہوتا ہے اور وہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص معاشرے کے اندر وہ غالب رہیں یہی وجہ ہے کہ فوکالٹ کے ہاں علم اور قوت ایک ہی چیز ہے اور اصل چیز بقاء ہے اصل چیز زندہ رہنا ہے اصل چیز بالا دستی قائم کرنا ہے حق کی تلاش اصل نہیں ہے اس لئے فوکالٹ کہتا ہے کہ انسان تو سترھویں صدی میں پیدا ہوا وہ اپنی کتاب (History of Sexuality) میں لکھتا ہے کہ انسان سترھویں صدی سے پہلے Sex کرنا بھی نہیں جانتا تھا لہذا جدیدیت پوری تاریخ انسانی کا، تمام مذاہب کا، تمام تہذیبوں کا، تمام روایات کا، تمام اقدار کا، تمام رویوں کا تمام ادوار وادیان کا انکار ہے، اس لئے کہ جدیدیت خود کو ایک نیا دور (Modern age) قرار دیتی ہے اور تمام ادوار اور تمام تہذیبوں کو قرون مظلمہ (Dark age) تاریک زمانہ روشنی سے محروم دور کہتے ہیں۔ لہذا ماڈرن ازم تاریخ کا بھی انکار ہے کیونکہ ماضی، سابقہ تاریخ، سابق تمدن جو سترھویں صدی میں تحریک تنویر یا تحریک روشن خیالی سے پہلے دنیا میں وجود تھے وہ اندھیرے میں تھے اندھیروں کی تخلیق تھے دنیا میں اندھیرے کا سبب تھے لہذا ان سب کو بھلا دینا، بھول جانا، ان سے رشتہ توڑ لینا ان سے ترک تعلق کرنا ماڈرن ازم کا خاص وصف ہے۔

ماڈرن ازم یا مغربی فکر و فلسفہ سے جنم لینے والے نظریات آزادی، ترقی اور مساوات:

ماڈرن ازم چونکہ ماضی سے ہر صورت میں ہر رشتہ منقطع کرنے پر مصر ہے، یہ تصور سترھویں صدی کے بعد پیدا ہوا تھا جو آج کل مغربی فکر و فلسفہ کا ایک خاص وصف ہے اور چونکہ اس فلسفے کے تناظر میں فائنل اتھارٹی صرف انسان ہے لہذا اس نظریئے سے آزادی، ترقی اور مساوات کے تصورات نکلتے ہیں، کیونکہ جب انسان خود خدا ہے پس خدا جو چاہے کرے اور ہر ایک آدمی بذات خود خدا ہے لہذا سب برابر ہیں اور ان دو باتوں کا نتیجہ ہی ترقی ہے، کیونکہ آزادی اور سرمایہ دونوں لازم و ملزوم ہیں، آیئے آزادی اور مساوات اور ترقی کا جائزہ لیتے ہیں کہ آزادی کیا ہے، آزادی کے فوائد کیا ہیں، آزادی کے نقصانات کیا ہیں؟ کس سے آزادی ہے؟ اور کس لئے آزادی ہے؟

آزادی:(Freedom)

مغرب میں آزادی کا مطلب اسلام کے تصور سے یکسر مختلف ہے مغرب میں دو قسم کا تصور آزادی ہے۔

(۱) منفی آزادی(Negative Freedom)

(۲) مثبت آزادی(Positive Freedom)

منفی آزادی/ یا ذاتی زندگی:(Private life)

منفی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ کسی فرد کی زندگی کا وہ گوشہ جس میں کوئی فرد کسی دوسرے کی مداخلت کے بغیر جو کچھ کرنا چاہے کر لے فرد جو چاہنا چاہے، چاہے اپنی چاہتوں کے لئے دوسری ہستی کے اگے جواب دہ نہ ہو ماں باپ کا، نہ خاندان کا، قبیلہ کا، نہ علماء دین کا، اللہ کا نہ پیغمبر کا بلکہ to be able to do what one wants to do انسان مکلّف ہے اس بات کا کہ خیر تخلیق کرویں لیکن خیر ہے کیا یہ

انسان خود متعین کرے گا اور خیر کی تبدیلی کرنے کا بھی ہر وقت آزادی رکھتا ہے ہر انسان خود شارع ہے اور جو چاہے اور جیسے چاہے چیز کی تفسیر وتشریح کرسکتا ہے وہ حق خود ارادیت Right of self determine متعین کرسکتا ہے۔ بالفاظ دیگر منفی آزادی کا مطلب خواہشات اور ارادے کی تکمیل میں ہر رکاوٹ کی نفی کردینا ہے۔Negation of All barriers

مثبت آزادی یا اجتماعی زندگی:Positive Freedom

مثبت آزادی سے مراد وہ گوشہ زندگی ہے جو دوسرے آزاد فرد کے ساتھ تعلق قائم کر کے گزارتا ہے اگر زندگی کا تعلق بیٹے، بہن اور باپ سے ہو تو یہ زندگی ذاتی نہیں رہے گی بلکہ اجتماعی زندگی(Public life) کہلائے گی، اس دائرہ کار کے شروع ہوتے ہی فرد کی آزادی ختم ہوجائے گی۔

مثبت آزادی میں کہ میں وہ چاہوں جو مجھے چاہنا چاہیے سوال یہ ہے کہ کون بتائے گا کہ تم اس بات میں آزاد ہو اور اس میں آزاد نہیں ہو، تو اس میں آزادی تہذیب روایات تاریخ اور اجتماعیت بتائی گی، اس کی مختلف شکلیں ہیں نیشنلزم، شوشلزم، کمیونزم، فاشزم، فمینزم اجتماعیت کی مختلف اشکال ہیں۔

اگر اجتماعیت کا اظہار نسل کی سطح پر ہو تو اس کو ریسلرزم کہا جاتا ہے جیسے میں کہوں کہ میں مسلمان ہوں۔

اگر اجتماعیت کا اظہار قوم کی سطح پر ہو تو اس کو نیشنلزم کہا جاتا ہے جیسے کہ میں کہوں کہ میں پاکستانی ہوں۔

اگر اجتماعیت کا اظہار ایک طبقے کی سطح پر ہو تو اس کو سوشلزم یا کمیونزم کہا جاتا ہے جیسے میں کہوں کہ میں ایک مزدور ہوں۔

اگر اجتماعیت کا اظہار قوم کی سطح پر نہ نسل کی سطح پر اور نہ طبقے کی سطح پر ہو بلکہ جنس کی سطح Genderbased پر ہو جیسے میں مرد ہوں، عورت ہوں تو اس کو فیمینزم کہا جاتا ہے۔

مثبت آزادی میں خیر کا تعین قوم، نسل اور طبقہ کرتے ہیں، لیکن جتنا خوفناک منفی آزادی کا تصور ہے اتنا اجتماعی آزادی کا۔

اجتماعی آزادی شروع ہوتے ہی فرد کی آزادی ختم ہوجائے گی وہ اپنے بیٹے اور بیوی کے معاملات میں بھی کسی قسم مداخلت کا حق نہیں رکھتا، اس لئے مغرب میں اگر باپ بچے کو ڈانٹ دے یا باہر جانے کی اجازت نہ دے تو بچہ پولیس کو طلب کرلیتا ہے کہ باپ میری ذاتی زندگی میں مداخلت کرتا ہے۔

بیوی ہر سال عدالتوں سے شوہر کے خراٹوں پر طلاق لیتی ہے امریکہ میں 58000 فائل صرف خراٹوں پر جمع ہوگئی ہیں کتے کے بھونکنے سے اگر کسی کی آزادی متاثر ہوتی ہے تو وہ فوراً جاکر (Compliane) کرتا ہے۔ کہ اس کتے کے بھونکنے سے میری آزادی متاثر ہوتی ہے۔ گویا مغرب میں ذاتی زندگی صرف اپنی ذات تک محدود ہے۔

آزادی کس سے اور کس لئے؟

انسان یا تو نفس کا بندہ ہے یا شیطان کا یا اللہ کا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کا نعرہ جو لگایا جاتا ہے تو آزادی کس سے اور کس لئے؟ کیونکہ ظاہر ہے اگر مغرب والے یہ نعرہ لگاتے ہیں تو ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم روایت تہذیب، والدین، خاندان، حلال وحرام اور جائز وناجائز کی جکڑ بندیوں سے آزادی چاہتے ہیں، کیونکہ ان کے ہاں فائنل اتھارٹی انسان ہے اور انسان جو کچھ چاہے کرسکتا ہے لیکن آزادی کا نعرہ جو ہمارے مسلمان تجدد پسند مفکرین لگاتے ہیں تو اس نعرے کی چھری کے نیچے ان کی تہذیب روایت، مذہب سب کچھ آئے گا، مذہبی نقطہ نظر سے یہ نعرہ بالکل غلط ہے انسان آزاد پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ وہ پیدائشی طور پر اللہ کا عبد یعنی بندہ ہے اور بندگی آزادی کی عین ضد ہے بندگی انسان کا ازلی اور ابدی مقام ہے اور اس مقام سے جستجو ایک شیطانی آزادی اسے شیطان کی بندگی کے قعر مذلت میں گرادیتی ہے۔

مساوات:

جب ماڈرن ازم میں انسان کو فائنل اتھارٹی یا خدا بنا دیا گیا، تو آزادی اس کا حاصل نتیجہ تھا اور چونکہ ہر انسان خود خدا ہے اور کسی کا تابع نہیں ہے لہذا عقلی طور پر مرد عورت، بوڑھا اور بچہ سب برابر ہیں۔

اس مغربی تصور آزادی نے مراتب، کا احترام ختم کر دیا، حقیقتوں کے مراتب بدل گئے اور حقیقتوں کے مقاصد بھی تبدیل ہو گئے اس بات کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ ایک چھ رکنی خاندان ہے جس میں دادا، بیٹا، بہو، چچا، چچی، پوتا شامل ہیں، روایتی الہامی اور مذہبی تہذیبوں میں ان حقیقتوں کی ترتیب یعنی ان کے مراتب کیا ہوں گے؟ ظاہر ہے پہلے دادا، پھر چچا، پھر چچی پھر بیٹا، پھر بہو پھر پوتا ہوں گے اگر مابعد الطبیعیاتی تناظر بدل جائے تو ان کے مراتب وجود کی حقیقت، مرتبہ اور مقصد تناظر کے بدلنے سے مسلسل بدلتے رہیں گے، اس کے ساتھ ساتھ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ مراتب کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ تو مساوات کے فلسفے کے خلاف ترتیب ہے اصلاً تمام انسان برابر ہیں لہذا سب بحیثیت انسان برابر ہیں مراتب کے چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں مراتب کے نتیجے میں آزادی کا دائرہ محدود ہوتا ہے، مساوات ممکن نہیں رہتی، ترقی کی رفتار سست ہو جاتی ہے، لہذا ہر شخص کو کسی قدغن کے بغیر آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے دی جائے، قاعدے اور قوانین انسان کی آزادی کو ختم کر دیتے ہیں کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں لہذا حفظ مراتب کی ضرورت نہیں اسی مساوات کی وجہ سے خاندانی نظام درہم برہم ہو گیا کیونکہ ہر آدمی برابر ہے، بڑے، بوڑھے اور چھوٹے کا کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ انسانیت پرستی (Human worship) کا تقاضہ یہ ہے کہ سب کو ایک نوع سمجھا جائے، یہی نظام مساوات کی بدولت جدید فلسفے اور ماڈرنزم کا لازمی نتیجہ تھا جو ان کو ملا، لیکن اسی مساوات کی اسلامیزیشن (Islamnization) کرنا جو کہ آج کل ہمارے تجدد پسند مفکرین کا ایک طرّہ امتیاز رہا ہے اور وہ دن رات اس کوشش میں لگے ہوئے

ہیں، حالانکہ آزادی اور مساوات کو اسلام میں ڈھونڈنا اسلام سے ناواقفیت ہے یہ تو مغرب کے مسائل ہیں، ہماری کونیات Cosmology میں ماں باپ کا برابر نہیں ہوسکتا، پیغمبر خدا کے برابر نہیں ہوسکتا، تابعی، صحابی کے برابر نہیں، فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والوں کے برابر نہیں ہوسکتے لہذا مساوات کا اصول اسلام میں ممکن ہی نہیں۔

مرد اور عورت اگر دونوں مساوی اور ایک ہی کام کیلئے پیدا ہوئے تھے تو پھر دونوں کو جسمانی طور پر الگ الگ پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی، یہی وہ بنیادی مسئلہ ہے جس کی طرف سے اکثر لوگ اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ کیا عورت اور مرد جسمانی ذہنی اور نفسیاتی حیثیت سے برابر برابر ہیں؟ ظاہر ہے حقیقت ایسی نہیں ہے اور اثبات کا کوئی بھی مدعی نہیں ہے لیکن آزادی نسواں کے علمبردار بڑی شدومد سے یہ آواز اُٹھاتے ہیں کہ مرد وعورت برابر ہیں، مساوی ہیں اور اس کو ہر قسم کی معاشرتی، معاشی اور تمدنی آزادی حاصل ہونی چاہیے لیکن اس آزادی اور بے مہاری کے باعث مغربی ممالک میں حد درجہ افسوس ناک معاشرتی، اخلاقی اور تمدنی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں، ان سے خود دانشوران یورپ تک پریشان ہیں اور علاج کسی کے بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے، بلکہ یہ ایک لاعلاج مرض اور تہذیب جدید کا ناسور بن چکا ہے یہ تہذیب جدید کی وہ آگ ہے جو اب مشرقی ممالک کو بھی جھلسانے لگی ہے۔

اسلام کا موقف:

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس نے عورت اور مرد کی فطرت اور ان کی ساخت کا لحاظ رکھتے ہوئے دونوں کو نہایت درجہ متوازن اور جامع حقوق عطاء کیئے ہیں اور دونوں کے فرائض وواجبات کا بھی پوری انصاف پسندی کے ساتھ تعین کیا ہے، اس لئے اسلام نے عورت کے حقوق کا تعین اس کی فطرت کے تقاضے کے مطابق منصفانہ طور پر کیا ہے اسلامی قوانین میں قوموں کے تمدنی قوانین کی طرح نہ افراط ہے۔ اور نہ تہذیب جدید

کے قوانین کی طرح تفریط، جو عورت کو سبز باغ دکھا کر اس کو گھر سے بے گھر کرنے اور اس کو در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کرنا چاہتی ہے تا کہ وہ مرد کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بن کر اس کے اشاروں پر ناچے۔

بہر حال اسلام میں عورت اور مرد دونوں انسان ہونے کی حیثیت سے مساوی مقام و مرتبہ رکھتے ہیں اور جہاں تک ان کے فرائض و واجبات کی ادائیگی کا تعلق ہے دونوں کا دائرہ کار الگ الگ ہے اسلام نے کنبے اور خاندان کا بوجھ یعنی معاشی ذمہ داریاں فطرت کے فیصلے کے مطابق مرد کے سپرد کی ہیں اور گھریلو انتظام وانصرام کا بوجھ و بار اس کی جسمانی ساخت کے مطابق عورت کے ذمے کیا ہے، ان دونوں کے ذہنی اور جسمانی، نفسیاتی حقائق کے بارے میں ایک صحیح اور فطری دائر کار ہے۔

ترقی:

مغربی تہذیب میں یا بالفاظ دیگر جدید فلسفے میں انسان خدا ہے، وہ آزاد ہے، جو چاہے کر سکتا ہے اور جو شخص جو کرنا چاہے جو اس کا دل چاہے سرمایہ ہی وہ شے ہے جو ممکن بناتا ہے کہ انسان جو کچھ بھی چاہے کر سکتا ہے سرمائے کے بدولت مغربی تہذیب اور جدید سائنس نے انسان سے اس کا قلب چھین لیا ہے مادی ترقی کرنے والی ہر قوم تمام گناہوں میں مبتلا ہے کیوں کہ زندگی کا مقصد صرف لہو ولعب بن گیا ہے اور اس کے لئے ایجادات کا سیل رواں چلا آ رہا ہے۔

سرمایہ کیا ہے؟ سرمایہ آزادی کا دوسرا نام ہے بلکہ سرمایہ داری میں آزادی کی جو شکل ہوتی ہے وہ کیپٹل ہوتی ہے آزادی کس کو حاصل ہوتی ہے اس کو حاصل ہوتی ہے جس کے پاس سرمایہ زیادہ ہو چونکہ سرمایہ داری میں کوئی تصور خیر موجود نہیں اس لئے جس چیز کو سرمایہ داری فروغ دیتی ہے وہ اخلاق رذیلہ ہیں، جو مذہب کی تعلیمات کا الٹ ہیں، سرمایہ انسان کو اپنی پرستش کی طرف مائل کرتا ہے، نفس کی پرستش کی طرف مائل کرتا ہے، خدا کی بندگی سے انکار کے لئے تیار کرتا ہے، اس معاشرے میں انسان کا نفس ہی اِلٰہ ہے انسان اسی

معبود کی پرستش میں زندگی بسر کرتا ہے سرمایہ داری اور آزادی اسی معبود کی پرستش کو ممکن بنانے کے ذرائع ہیں۔

فلسفے کی ان تمام مباحث سے معلوم ہوا کہ مغربی تہذیب جو کہ جدید فلسفے پر مبنی ہے ایک باطل تہذیب ہے اور مغربی تہذیب سے کسی مصالحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے اعتقادات، حق خیر اور اخرت کی نفی پر مشتمل ہیں اور یہ خالص کفر ہے، انسان کے بارے میں، کائنات کے بارے میں، تصور خیر کے بارے میں تصور حق کے بارے میں یہ افکار شرک سے بھی آگے کی ایک منزل ہے، مغرب اور مذاہب عالم اور خصوصاً اسلام کے مابین بنیادی نوعیت کے علمیاتی اختلافات ہیں لہذا مغرب و مشرق کے درمیان مصالحت و مکالمے کی کوشش ایک غیر فطری کوشش نظر آتی ہے۔

سائنس:

سترھویں صدی سے پہلے تمام فلسفیوں کو مابعد الطبیعیاتی تناظر میں کسی حقیقت کی تلاش اور جستجو تھی، لیکن بعد کے لوگوں نے عالم طبعیت اور مادے کے سواء ہر چیز کا انکار کردیا، چیزوں کی حقیقت صرف حسیات، مشاھدات اور تجربات تک محدود رہی یہاں تک کہ مذہبی حقیقت کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتے تھے جب تک سائنس اس کی تصدیق نہیں کرتا ساتھ ساتھ معقولات کی صحت کے لئے بھی تجربے کو معیار قرار دیا گیا مغربی فلاسفہ نے سائنس کو حقیقت کی تلاش کے وسیلہ کے طور پر اختیار کیا لیکن آخر کار تلاش حقیقت سے دستبردار ہو کر مغرب نے اس وسیلے یعنی سائنس کو اصل، حقیقت الحقائق، حقیقت اولی، حقیقت مطلق اور خیر قرار دیا اور رفتہ رفتہ مغرب میں سائنس ہی خدا بن گئی اس نئے معبود باطل نے انسانی افکار و جذبات کی دنیا میں عہد قدیم کی بت پرستی سے کچھ کم بگاڑ پیدا نہیں کیا، آج کے انسان کو سیدھی راہ سے بھٹکانے میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔

سائنس کی تعریف:

Science: Knowledge obtained by observation and Experiment.

وہ علم جو تجربات اور مشاہدات سے حاصل کیا جائے:

سائنس حصول علم کا ایسا طریقہ ہے جس میں حواس خمسہ کے ذریعے مشاہدات کر کے اور پھر ان مشاہدات کے تناظر میں نظریات قائم کیے جاتے ہیں۔

اہل مغرب کی تنگ نظری:

کائنات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا وسیلہ ہونے کے لحاظ سے سائنس کو بھی تھوڑی بہت اہمیت حاصل ہے، مگر اس کی یہ تھوڑی بہت کامیابیاں اس وقت حسرتوں اور نامرادیوں میں بدل گئیں جب اہل مغرب نے سائنس کو الوہیت کے مقام پر بٹھا دیا اور اسے اپنی محبتوں، عقیدتوں اور اطاعتوں کا واحد مرکز بنالیا، اہل مغرب کی اس افسوس ناک غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے تجرباتی سائنس۔ (Empirical Scincce) کے تجربہ و مشاہدہ کے محدود وسائل کے سوا علم و معلومات کے باقی وسائل سے اپنے آپ کو محروم کرلیا اور انسانیت اپنی منزل مقصود کے قریب آنے کی بجائے اس سے اور دور ہوگئی، انسان کے سامنے ترقی اور سعی و جہد کے جولامحدود امکانات تھے وہ اہل مغرب کی تنگ نظری اور مادی سائنس کی ناگزیر محدودیتوں کی نظر ہوگئے کیونکہ سائنس جو عقل کے پروں سے اڑتی ہے انسانیت کی بلند پروازی کا ساتھ نہیں دے سکتی، جو عقل اور روح دونوں سے مدد حاصل کرتی ہے اور تب کہیں اپنے خالق کا قرب اور حقیقت نفس الامری کا واضح اور صحیح شعور حاصل کرنے کے قابل ہوتی ہے۔

علم کی حقیقت اور سائنسی تصور علم:

وحی اور انبیاء کی تعلیمات کے علاوہ اور کوئی ایسا ذریعہ علم نہیں جس کے ذریعے انسان حقیقت کا ادراک کر سکے، حقیقت کی معرفت ایمان اور دائمی شریعت پر عمل کیے بغیر کسی

اور ذریعے سے ممکن ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ تمام روایتی اور مذہبی تہذیبوں میں علم کا منبع اور ذریعہ خارجی ہوتا ہے اور یقین کا فائدہ دیتا ہے وحی اور انبیاء کی تعلیمات سے حاصل شدہ علم صرف مرئی اور طبعی دنیا(Physical world) تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ غیر مرئی دنیا (یعنی موت، برزخ، آخرت) کا بھی علم فراہم کرتا ہے، اس علم سے انسان کو اس بات کا علم بھی حاصل ہوتا ہے کہ انسان کون ہے، کہاں سے آیا ہے؟ مرنے کے بعد کہاں جائے گا؟ اس کا خالق کون ہے؟ اس کا مقصد زندگی کیا ہے؟ اس علم سے انسان الٰہیات، ایمانیات، اعتقادیات، مابعد الطبیعات اور مادی دنیا سے ماوراء کائنات کا علم بھی حاصل کرتا ہے، اس علم کا مقصد خدا کی تلاش، قربت، معرفت اور جستجو ہے، جبکہ اس کے مقابل سائنسی تصور علم اس علم سے بالکل منفرد ہے، سائنسی تصور علم میں یقین علم کی موت ہے، اس کا منبع انسان ہے، لہذا وحی کے ذریعے حاصل کیا جانے والا علم صحیح معنوں میں علم کہلانے کا مستحق نہیں، کیونکہ اس علم کی بنیاد انسان سے باہر ہے یعنی خدا کی طرف سے ہے، سائنسی تصور علم میں جس علم (Knowledge) پر یقین ہو وہ سائنسی و فلسفے کی دنیا میں علم ہی نہیں کہلاتا علم کی بنیاد پر علم کا آغاز اور علم کا انجام شک ہے، شک سے ماورا علم بلا شک وشبہ دائرہ علم سے خارج ہے، جدید سائنس(Modern Science) درحقیت وحی سے علی الرغم اور بغاوت خداوندی پر مبنی علمیت کا نام ہے، انسان ہی مرکز کائنات۔(Center of (the universe ہے۔ معبود اور فاعل خود مختار ہے، خالق خیر وشر ہے، علم کی تشکیل وحی کے بغیر خالصتاً عقل کی بنیادوں پر کی جاسکتی ہے، عقل کو بنیاد بنا کر ایک ایسے علم کی تعمیر کی جاسکتی ہے جو نہ صرف یہ کہ آفاقی ہوگا، بلکہ ہر قسم کی ایمانیات، نظریات ومعروضات سے پاک ہوگا، لیکن حقیقت یہ ہے، کہ یہ تمام دعوے جھوٹے ہیں، مغرب کا اہم ترین فلسفی (Hume) اصول استقراء (Induction) کی منطقی اور تجربی توجیہہ کو ناممکن تصور کرتا ہے، کہ سائنس کو عقلی طور پر واضح نہیں کیا جاسکتا۔

We Can accept That Science is based on induction. and Hume's demonstration that

induction Connot be Justified by appeal to logic or exprience and canclude That Science can,t be rationally Justified. Hume himslf adopted a Position of That kind .

[what is this thing Called Seince page 19]

جدیداور قدیم سائنس کا فرق:

جدید اور قدیم سائنس کے تقابلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سترہویں صدی تک سائنس نے کامل الحاد کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا کوپرنیکس (Copernicus) کپلر (Kepler) گیلیو (Galileo) نیوٹن اور سائنس کے دوسرے علمبرداروں میں سے کوئی بھی خدا کا منکر نہ تھا، مگر یہ کائنات کے اسرار کی جستجو میں الٰہی نظریہ سے قطع نظر کر کے ان قوتوں کو تلاش کرنا چاہتے تھے، جو اس نظام کو چلا رہی ہیں، لیکن اس نظریئے نے جدید وقت میں ایک بے خدا سائنس تیار کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا، کیونکہ سائنس کے نزدیک انسان کا کائناتی تسلط ہی اصل حقیقت اور مقصد انسانی ہے۔

(۱) قدیم سائنس میں فطرت کا مطالعہ برائے مطالعہ ہوتا تھا، جبکہ جدید سائنس میں تسخیر فطرت کے لئے ہوتا ہے۔

(۲) قدیم سائنس معاشرے کے لئے ایک خادم کی حیثیت سے کام کرتی تھی، جبکہ جدید سائنس حاکمانہ تسلط قائم کرتی ہے۔

(۳) قدیم سائنس حقیقت کو ایک ٹھوس چیز سمجھتی تھی جبکہ جدید سائنس حقیقت کو مبہم اور دھندلی چیز سمجھتی ہے۔

(۴) قدیم سائنس کا وجود حقیقت کے تصوّر سے نکلتا تھا، وہ جو حقیقت مطلق اور حقیقت ازلی ہے جیسے باری تعالیٰ اس کے برعکس جدید سائنس کا تصور حقیقت مطلقہ ''خدا'' سے انکار پر مبنی ہے۔

(۵) قدیم سائنس میں زندگی کا ایک مقصد اور نصب العین ہوا کرتا تھا، جبکہ جدید

سائنس نے مادی ترقی کو فروغ دے کر انسان کو ہر گناہ میں مبتلا کر دیا، زندگی کا مقصد، لہو ولعب اور پر تعیش زندگی گزارنا قرار دیا، جس کے لئے ایجادات کا سیل رواں چل رہا ہے۔

(۶) جدید سائنس کا تعلق سرمایہ داری سے ہے، اگر جدید سائنس سے سرمایہ داری کو الگ کر دیا جائے تو جدید سائنس کی بنیادیں ہی متزلزل ہو جائیگی، جدید سائنس اور سرمایہ داری لازم ملزوم ہیں۔

جدید سائنس کا بانی نیوٹن:

سر آئزک نیوٹن ۱۶۴۳ء میں کرسمس کے روز انگلستان کے ایک بہت چھوٹے سے گاؤں کے مزرعہ خانہ میں پیدا ہوا، نیوٹن جب دو سال کا تھا تو اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی اور اس کو اپنی دادی کے ساتھ رہنے کے لئے بھیج دیا، چودہ سال کی عمر میں ائزک کو اس کی ماں نے اپنے ساتھ رہنے اور مزرعے کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لئے واپس بلا لیا نوجوان نیوٹن کھیتی باڑی کے لئے بالکل بے کار ثابت ہوا، اور نیوٹن نے اپنی ماں کو کالج جانے کے لئے رضامند کر کے کالج میں داخلہ لے لیا، ۱۶۶۵ء میں نیوٹن نے بی۔اے (B-A) کر لیا ۱۶۶۷ء میں نیوٹن کو کیمبرج یونیورسٹی میں معمولی مدرس کی حیثیت سے تعینات کئے گئے وہ تیزی سے ترقی کرتا رہا اور چھبیس سال کی عمر میں اپنے استاد اور مربی ائزک بارود کی جگہ پر ریاضی کا پروفیسر ہو گیا، نیوٹن ایک مذہبی شخص اور فلسفی بھی تھا، ریاضیات، میکانیات، تجاذب اور علم المناظر میں نیوٹن کی کامرانیاں اتنی زیادہ اور اساسی تھیں، کہ اگر وہ کچھ اور نہ کرتا، تو ان میں سے کوئی سی بھی ایک کامرانی بحیثیت سائنسدان شہرت دوام بخشنے کے لئے کافی تھی، نیوٹن کو جدید سائنس کا بانی تصور کیا جاتا ہے، نیوٹن نے نصف زندگی مذہبی کتابیں لکھیں، وہ خدا کے وجود کا دل سے قائل تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ خدا کائنات بنا کر اس سے الگ تھلگ ہو گیا ہے، اس تصور نے ایک بے خدا سائنس تیار کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا، نیوٹن پہلا مفکر تھا جسے مابعد الطبیعاتی حقیقتوں سے کوئی رابطہ نہ تھا، وہ اس چیز پر اکتفا کرتا تھا کہ استقرائی اصولوں کو علم ریاضی

سے ملا کر جو حقیقت دریافت ہو سکے وہ سمجھ لی جائے، بشرطیکہ اصول اس طرح قائم ہوں کہ ان کو ان کے نتائج سے نسبت ہو اور اس طرح ان کا ایک خلاصہ بن سکے، اس طرح نیوٹن نے تجرباتی نظریئے کو فروغ دے کر ارسطو کے ان اصولوں سے علیحدگی اختیار کی جس بناپر ارسطو کا کہنا تھا کہ فطرت کو چند بین اصولوں سے سمجھایا جا سکتا ہے، اسی طرح استقرائی بنیاد پر جدید سائنس کی بنیاد پڑی۔ سائنس میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ ''کشش ثقل'' کا قانون ہے، نیوٹن کا مغربی ذہن پر بہت گہرا اثر ہے لیکن اب سائنس نیوٹن سے بہت آگے چلی گئی اور اس کے تصوّر کائنات کو رد کر دیا گیا ہے، مگر اس کے نظریات نے جو ذہنیت پیدا کی تھی وہ بڑھتی چلی گئی ہے۔

جدید سائنس اور جدید فلسفے کا فروغ کیسے ہوا:

جاگیرداری نظام کی ابتداء میں چرچ سماج کا ایک ترقی پسند اور زندہ جزو تھا، اس زمانے میں چرچ کی ریاست کا رقبہ دن بدن بڑھتا جاتا تھا، زمیندار اپنے زمین کا عشر اور موت کا ٹیکس چرچ کو دیا کرتے تھے، کاشت کار اور چھوٹے چھوٹے کاریگر اپنی آمدنی کا دسواں حصہ ادا کرنے پر مجبور تھے، گھاس بھی ٹیکس سے مستثنیٰ نہ تھی، چرچ کی دولت جتنی بڑھتی گئی، اس کی روحانی حیثیت ختم ہوتی گئی اور معاشی حیثیت نمایاں ہوتی گئی، سینٹ لوئیس (St. louis) کے زمانے میں ڈیم ڈی پیرس کی خانقاہ کے عہدہ داروں نے کاشت کار غلاموں کو اس طرح لوٹا کھسوٹا کہ ملکہ بلشنے نے ان ظالمانہ حرکات کے خلاف احتجاج کیا، لیکن چونکہ چرج طاقتور تھا، اس احتجاج کا چرچ پر کوئی اثر نہ ہوا، بلکہ ستم بالائے ستم یہ کہ راہبوں نے لاپرواہی سے یہ جواب دیا کہ ہم خودمختار ہیں، جو کچھ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں ہم ان کاشتکاروں اور غریبوں کو بھوک سے مروا بھی سکتے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک وقت وہ بھی آ گیا کہ پوپ کی قوت بادشاہ سے بھی زیادہ ہوگئی تھی سیاسی مذہبی اور دولت کی بھر مار نے چرچ کو ایک مضبوط اور وقت کا اہم ترین ادارہ بنا دیا تھا، اپنے طاقت کے بل بوتے مسیحیت کے پیشوائے اعظم اور

حضرت مسیح کی خلافت کے مدعی پاپائے روم نے دین کے نام پر مظالم ڈھائے اور صدیوں جاری رکھے یہ انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ گھناؤنی وحشت و بربریت کا باب ہے ۱۴۸۱ء ۱۸۰۸ء تک اس نے تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو مختلف سزائیں دیں ان بدنصیبوں میں بتیس ہزار انسان ایسے تھے جنہیں زندہ جلا ڈالا گیا، کلیسا کی یہ انتہائی تنگ نظری رجعت پسندی، علم دشمنی اور وحشیانہ بربریت نے مارٹن لوتھر کو پیدا کیا، مارٹن لوتھر نے ۱۵۱۷ء میں اپنے پچانوے اقوال وٹن برگ کے چرچ کے دروازے پر چسپاں کئے تھے لوتھر (Luther) کالون (Calvin) اور ناکس (Knoz) نے اپنی تجدید واصلاح کی تحریک صرف مذہبی امور تک محدود نہیں رکھی بلکہ انہوں نے مذہبی حدود سے بھی کچھ آگے بڑھ کر قدم جمانے چاہے، اور مذہب کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی لوگوں کی رہنمائی شروع کی، لیکن پروٹسٹنٹ رہنما بھی پادری ہی تھے، وہ مسلمانوں کی صرف دینی ازادی سے متاثر ہوئے تھے مگر علم کی دشمنی میں پوپ اور اس کے ماننے والوں سے پیچھے نہ تھے، خود اس فرقے کے بانی، لوتھر نے ارسطو کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پروٹسٹنٹ بھی اپنی دینی آزادی اور پوپ کے جاہلانہ وجابرانہ اقتدار سے بغاوت کے باوجود علم سے کس قدر متنفر تھے۔

مسیحیت کی علم دشمنی اور جہل کی عمومیت کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ اخلاقی، اجتماعی اور معاشرتی لحاظ سے اسفل سافلین میں پہونچ گیا، اخلاقی گروات کا یہ حال تھا کہ راہبوں کی خانقاہیں زہد وتقویٰ کے بدلے فسق وفجور کا مرکز بن گئیں اور امراء کو کلیسا نے آزادی دے دی کہ پوپ کا خزانہ اگر بھرتے رہیں، تو جو جی میں آئے دل کھول کے کرتے رہیں، اسی صورتحال کے نتیجے میں تحریک تنویر اور تحریک رومانیت وجود میں آئیں، جس کا مطلب یہ تھا کہ عقل استقرائی (Inductive Reason) اور عقل استخراجی (Deductive Reason) کے ذریعے حقیقت تک رسائی ہوسکتی ہے، جس کے نتیجے میں سیکولرزم، لبرل ازم، فریڈم نیشنل ازم، مارکس ازم، سوشلزم، کیپٹل ازم،

کیمونیٹرین ازم اور ملٹی کلچرازم جیسے مختلف مکاتب فکر پیدا ہوئے ، ان تمام مکاتب فکر کی ایمانیات ، اساسیات اور اعتقادات کے مطابق انسان ہی عقل کل ہے، انسان ہی حقیقت مطلق ہے، انسان ہی مرجع ، مصدر ، ماخذ اور منبع علم ہے، لہذا انسان جو کچھ کرنا چاہے وہ کرسکتا ہے وہ آزاد ہے، وہ کسی اتھارٹی کے حکم کا پابند نہیں، کسی الہامی ضابطے کا پابند نہیں کیا جاسکتا، الغرض انسان جس قدر کا طلب گار ہے، وہ آزادی ہے اور آزادی کی طلب اور آزادی کی جستجو بنیادی طور پر سرمایہ پر ہوتی ہے اور یہی سرمایہ اور دولت ایجادات کا باعث بنتی ہے اٹھارہویں صدی کے بعد مغرب میں جو روز روز نت نئے ایجادات ہو رہے ہیں اس کے پیچھے بھی سرمایہ ہے اٹھارھویں صدی تک انگلستان ایک زرعی ملک تھا لیکن مسلمانوں پر قابض ہو گئے تو ھندوستان کی دولت سمندری طوفان کی طرح انگلستان میں آنے لگی، یہی دولت ایجادات کا باعث بنی، برطانیہ کی صنعتی تاریخ کے ماہر ڈاکٹر کنگھم نے لکھا ہے کہ ایجادیں اتنے بڑے پیمانے پر اس لئے نہیں ہوئیں کہ غلط لوگوں کی ذہانت آناً فاناً پھوٹ پڑی ہو، اصل وجہ یہ تھی کہ ملک میں سرمایہ اتنا اکٹھا ہو گیا تھا کہ ان ایجادات کا مصرف نکلنے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔

نسلی قتل عام، بہیمیت اور وحشت و بربریت مغربی اقوام کی ایک خصوصی خاصیت ہے اپنی اسی خاصیت کی بنیاد پر ان مغربی اقوام نے پچاس کروڑ لوگوں کو قتل کیا ہے اور اربوں اور کھربوں روپوں کی لوٹ مار کی ہے، ان لاشوں اور لوٹ مار پر جدید سائنس کی عمارت کھڑی کی گئی ہے، لوٹ مار کی یہی دولت اس حیرت انگیز سائنسی انکشافات کی بنیاد بنی جو آج ہر شخص کو فطری، حقیقی، ضروری اور عین اسلامی معلوم ہوتی ہے۔

سائنسی علوم کی قسمیں:

کائنات کے تین واضح طبقے ہیں:

(۱) مادہ۔ (۲) زندہ اجسام۔ (۳) نفس انسانی

(۱) مادہ کی ماہیت سے تعلق رکھنے والے علوم یا طبعیاتی علوم جن میں علم طبعیات،

علم کیمیا، علم الافلاک، علم الارض وغیرہ شامل ہیں۔

(۲) زندگی کی ماہیت سے تعلق رکھنے والے علوم یا حیاتیاتی علوم جن میں حیاتیات، علم نباتات، علم الحیوانات، علم الجنین، علم الابدان اور طب وغیرہ شامل ہیں۔

(۳) نفس انسانی کی ماہیت اور اس کے مظاہر سے تعلق رکھنے والے علوم یا انسانی یا نفسیاتی علوم جن میں نفسیات فرد، نفسیات جماعت، علم التاریخ، علم السیاسیات، علم الاخلاق اور علم الاقتصاد وغیرہ شامل ہیں، ہم ان تینوں قسموں کو طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات بھی کہہ سکتے ہیں۔

سائنسی نظریات کا ارتقاء:

سائنسی نظریات کا ارتقاء کیسے ہوتا ہے کس طرح نظریئے وجود میں آتے ہیں اور پھر کس طرح ترقی کرتے رہتے ہیں، سائنسی مفکرین اس کے بارے میں چار بڑے گروہوں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔

(۱) فرقہ استقرائیت (Inductivism)

(۲) فرقہ تردیدیت (Falsificationism)

(۳) فرقہ ساختیت (Structurlists)

(۴) انارکسٹ (Anarchists)

(۱) فرقہ استقرائیت:

اس فرقے کے مطابق سائنسی نظریات اور علم کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ ہے اور سائنس وہ ہے جو ہمیں حواس خمسہ کے تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے، یعنی سائنس حصول علم کا ایسا طریقہ ہے جس سے مشاہدات (Obrervation) کی بنیاد پر نظریات (Theories) قائم کئے جاتے ہیں اور انفرادی نوعیت کے تجربات (Singular Statement) کی بنیاد پر آفاقی نظریات (Universal Statment) کی تعمیر کرنا ممکن ہے، جن کی مدد سے حوادثات عالم کی تشریح و پیش گوئی کی

جا سکے اس نظریئے کے مطابق سائنس کا مقصد نظریات کو ثابت کرنا ہے۔
A.F Chalmers اپنی کتاب میں اس فرقے کو اس طرح بیان کرتا ہے:

Scientific Knowledge is proven knowledge. Scientific Theories are derived from in some rigorous way The facts of experience acquired by observation and experiment. Science is based on what we can see and hear and touch etc.

[what si this thing called Science.page no.1]

ذاتی تجربے اور مشاہدے سے افاقی نظریات:

استقرائی نظریہ سائنس کے علماء کے مطابق ذاتی تجربے اور مشاہدے سے آفاقی نوعیت کے نظریات حاصل کئے جا سکتے ہیں لیکن اس کے لئے تین شرائط ہیں۔

(۱) انفرادی نوعیت کے مشاہدات کی تعداد بہت زیادہ ہو۔
(۲) مشاہدات مختلف قسم کے حالات کے تحت روبہ عمل ہوں۔
(۳) کوئی بھی مشاہدہ آفاقی دعوے کے خلاف نہ ہو۔

چامر اس کو کچھ اس طرح بیان کرتا ہے:

The Conditions That must be satisfied for such generalizations to be considered legitimate by the inductivist can be listed thus.

(1) The number of observation statements forming the basis of generalizations must be large.

(2) The observations must be repeated under a wide variety of conditions.

(3) No accepted observation Statement should conflict with The derived universal law. [what isi this thing called Science.page no.4]

مسئلہ استقرائیت: Problem of induction

استقرائی نظریہ سائنس کے علماء کے مطابق اگرچہ ذاتی تجربے اور مشاہدے کے نتیجے میں چند شرائط کے ساتھ آفاقی نظریات کی تعمیر ممکن ہے، لیکن پھر بھی ان شرائط کے ہوتے ہوئے بھی ان کے لئے کئی مسائل کھڑے ہو گئے ہیں، جن کو Problem of induction کہا جاتا ہے۔ جن کو چامر نے اپنی کتاب صفحہ نمبر ۱۹ Possible responses to The problem of induction کے عنوان سے پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔

استقرائی نظریہ سائنس کے علماء کے مطابق اگر سائنس تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر افاقی نظریے قائم کرنے کا نام ہے تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ کیا منطقی اعتبار سے ایسے نظریات درست ہوتے ہیں؟ اس کا جواب بالکل نفی میں ہے کیونکہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ تمام کوّے کالے ہیں اور اس کی دلیل یہ پیش کرے کہ اس نے مختلف اوقات میں متعدد مقامات پر اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ کوے کالے ہیں، لیکن اس کے اس مشاہدے سے یہ بات منطقی طور پر صحیح ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے پاس کونسی ایسی دلیل ہے کہ اگرا گلا کوا جس کا مشاہدہ کیا جائے گا وہ کالا نہ ہوگا، کیونکہ ایک شخص تمام دنیا کے کوؤں کا مشاہدہ نہیں کرسکتا ہے بلکہ اس ناممکن تجربہ سے آفاقی نظریات کی تعمیر نہیں کی جاسکتی ہے چاہے کسی آفاقی نظریے کی منطقی صحت ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں اس ضمن میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ کثیر تعداد سے مراد کیا ہے یعنی جب یہ کہا جاتا ہے کہ انفرادی نوعیت کے مشاہدات بہت زیادہ ہوں تو کثیر سے مراد کتنے مشاہدات ہوسکتے ہیں دس، بیس، سو، ہزار، لاکھ، کبھی کبھی ایک مشاہدہ بھی آفاقی نوعیت کے نظریات کی تعمیر کرسکتا ہے اور کبھی ہزاروں مشاہدے بھی کافی نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر ایٹم بم کا

ایک مشاہدے کی بنیاد پر قائم ہے کیا یہ بھی سائنسی نظریہ ہے؟ چامراس فرقے پر کچھ یوں سوال کرتا ہے:

How many observations make up a large number? Should a metal bar be heated ten times, a hundred times, or how many times.

آگے لکھتا ہے:

I refer to the strong public reaction against ncllear warfare that followed the dropping of the first atomic bomb on Hiroshima towards the end of the second world war. This reaction was based on the understanding that atomic bombs cause widespread death and destruction and extreme human Suffering. And yet this generally held belief was based on Just on dramatic observation.

[whati is this thing called Science.page no.16]

مشاہدات کے لئے کونسے حالات ہوں:

استقرائی علماء مشاہدات سے حاصل شدہ آفاقی نظریات کی صحت کے لئے یہ شرط لگاتے ہیں کہ مشاہدات مختلف قسم کے حالات کے تحت روبہ عمل ہوں یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ کونسے حالات کے تحت مشاہدہ اور تجربہ کامیاب ہوگا اور کونسے حالات کے تحت مشاہدہ اور تجربہ کامیاب نہ ہوگا، کونسے حالات مشاہدے کے نتائج کے لحاظ سے اہم ہیں جبکہ باقی غیر اہم، اس بحث سے معلوم ہوا کہ سائنسی علم کی بنیاد مشاہدہ نہیں ہوسکتی۔

یہاں تک کہ مغرب کا اہم ترین فلسفی Hume اصول (induction) منطقی اور تجربی توجیہہ کو ناممکن تصور کرتا ہے کہ سائنس کو عقلی طور پر واضح نہیں کیا جا سکتا وہ سائنسی نظریات اور قوانین پر ایمان ویقین کو ایک نفسیاتی عادتوں کے طور پر دیکھتا ہے لہذا ثابت ہوا کہ یہ دعویٰ کہ علم کی بنیاد تجربہ ہو سکتا ہے غلط ہے۔

(۲) فرقہ تردیدیت: (Falsificationism)

استقرائی اور استخراجی طریقہ منطق سے کسی نظریئے کا اثبات ناممکن الوقوع ہے، لہذا اس فرقے کے مطابق سائنسی علم کی بنیاد ایسے نظریات ہیں جو تجربے کی روشنی میں غلط ثابت کیے جا سکتے ہوں، اس فرقے کے مطابق سائنسی نالج کی تعمیر نظریات کو غلط ثابت کرنے سے ہوتی ہے۔ اس نظریہ سائنس کا بانی کارل پاپر (Karl Popper) ہے۔ اس نظریہ سائنس کے مطابق پہلے نظریئے بنتے ہیں پھر مشاہدات اور تجربات کسی نظریئے کی تصدیق اور تردید کے حق میں حکم لگانے کے لئے کئے جاتے ہیں، ہزاروں مشاہدوں اور تجربات سے کسی نظریئے کی تصحیح اور تصدیق نہیں کی جا سکتی ہے، لیکن ایک مشاہدے سے اس نظریئے کی تکذیب اور تردید کی جا سکتی ہے، مثال کے طور پر یہ مشاہدہ کہ تمام کوے کالے ہیں اس بات کی تصدیق اور تصحیح ہزاروں مشاہدات سے بھی ناممکن ہے لیکن اگر ایک کوا ایسا دیکھا کہ وہ کالا نہ ہو تو اس ایک مشاہدے سے پہلے ہزاروں مشاہدے غلط ثابت ہوئے، اس نظریئے کے مطابق سائنس ترقی کرتی رہتی ہے۔

According to falsificationism, some theories can be shown to be false by an appeal to the results of observation and experiment. There is a simple, logical point that seems to support the falsificationist here. I have already indicated in Chapter 2 that, even if we assume that true observational

Statements are available to us in some way, it is never possible to arrive at universal laws and theorles by logical deductions on that basis alone. on the other hand it is possible to perfom logical dedutions starting from singular .observation statements as premises. to arrive at the falsity of universal laws and theories by logical deduction. For example, if we are given the statement, " A raven which was not black, was observed at place x at time t" then it logically follows from this that "All ravens are black" is false. That is, the argument Premise: A raven; which was not black, was observed at place x at time t.
Conclusion: Not all ravens are black.

[waht is this thing called Science chpter.4 page No.38-39]

پاپر جو اس نظریہ سائنس کا بانی ہے یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ سائنس کوئی معروضی حقیقت نہیں، سائنس ہم اپنی غلطیوں سے سیکھتے ہیں، سائنس ترقی Trial and Error کے ذریعے منطقی طور پر آفاقی قوانین اور نظریئے وضع کرنا امر محال ہے۔ ہم ہر لمحے سچ کے بارے میں زیادہ جان سکتے ہیں اور سچ کے قریب پہنچ سکتے ہیں دوسرے معنوں میں ہم سچ کو مطلق طور پر پانے کی جدوجہد ہی کرتے رہتے ہیں حاصل نہیں کر پاتے۔

Highly falsifialbe theories should be preferred to less falsifiable ones, then, provided they have not in fact been falsified. The qualification is important for

the falsificationist. Theories that have been falsified must be ruthlessly rejected. The enterprise of science consists in the proposal of highly falsifiable hypotheses, followed by deliberate and tenacious attempts to falsify them. To quote popper: "I can therefore gladly admit that falsificationsits like myself much prefer an attempt to solve an interesting problem by a bold conjecture, even (and especially) if it soon turns out to be false, to any recital of a sequence of irrelevant truisms.We prefer this. because we belive that this is the way in which we can learn from our mistakes; and that in finding that our conjecture was false we shall have learnt much about the truth, and shall have got nearer to the truth.

(We learn from our mistakes. Science progresses by trial and error. Because of the logical situation that renders the derivation of universal laws and theories from observation statements impossible, but the deduction of their falsity possible, falsifications become the important landmarks, the striking achievements, the major growing-ponts in science.

[waht is this thing called Science chpter.4 page No.43]

سائنس کے اس نظریے کے مطابق جس نظریے کو جتنے زیادہ مشاہدوں سے غلط ثابت کیا جاسکتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ سائنسی علم ہونے کا استحقاق رکھتا ہے جو نظریات غلط ثابت ہو جاتے ہیں وہ خارج از سائنس سمجھے جائیں گے۔ جو غلط ثابت نہ ہو جائیں تو وہ تو باقی رکھے جائیں گے۔ جب تک کہ وہ غلط ثابت نہ ہوں لہذا جو نظریہ بار بار مشاہدات اور تجربات سے بھی غلط ثابت نہ ہو سکے تو ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ نظریہ غلط نہیں اور درست بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ کل مزید مشاہدات اور تجربات سے غلط ثابت ہونے کا امکان ہے۔

> It can never be said of a theory that it is true, however well it has withstood rigorous tests, but it can hopefully be said that a current theory is superior to its predecessors in the sense that it is able to withstand tests that falsified those predecessors.

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوئی کہ مذہبی نظریات، ایمانیات وتصورات سائنسی علم کی بنیاد نہیں بن سکتے، کیونکہ انہیں کسی بھی قسم کے ممکنہ تجربے سے غلط ثابت نہیں کیا جاسکتا مثلاً یہ عقیدہ کہ خدا ہے کسی ممکنہ حسی تجربے یا مشاہدے میں لا کر غلط ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

نظریہ تردیدیت کی علمی کمزوریاں:

اس نظریہ کے علماء کے مطابق نظریات کی صحت کو تجربات کی بنیاد پر جانچا جاسکتا ہے اور کسی نظریہ کی تردید مشاہدات اور تجربات سے کی جاسکتی ہے لیکن یہ معروضہ بذات خود غلط ہے کیونکہ اگر کسی تجربے اور مشاہدے سے ہم کسی نظریئے کو رد (Reject) کرتے ہیں، وہ تجربہ اور مشاہدہ بذات خود ایک نظریئے کا محتاج ہوتا ہے، لہذا یہ دعویٰ کرنا کہ تجربات کی روشنی میں نظریات کو ثابت کرنا لغو اور باطل ہے اور اسی طرح ہر مشاہدہ اور

تجربہ تمام کوے کالے ہیں کی طرح آسان بھی نہیں ہوتا بلکہ پیچیدہ مشاہدات کے لئے پیچیدہ تجربات کرنے ضروری ہیں، جس میں کئی دعوے کسی ایک مرکزی خیال کے ساتھ پیوست ہوتے ہیں لہذا یہ دعویٰ کہ محض ایک تجربہ پورے نظریئے کو غلط ثابت کرنے کے لئے کافی ہے درست نہیں۔

(۳) فرقہ ساختیت: (Stvucturalists)

سائنسی نظریات کی تصدیق یا تردید مشاہدات کی مدد سے نہیں کی جاسکتی جیسا کہ پہلی بحث سے ثابت ہوا، لہذا اس فرقے کے مطابق کسی سائنسی حقیقت اور علم اسی خاص منھاج اور مابعد الطبیعیاتی حقائق کے ماتحت روبہ عمل ہوتی ہے اور اس کو خاص تحقیقی منھاج (Paradigm) یا (Structure) کہا جاتا ہے، اسی خاص ڈھانچے منھاج اور دائرے سے باہر نکلتے ہی سائنسی سچائی، سچائی نہیں ہوتی، بالفاظ دیگر کسی نظریے کی مابعد الطبیعات کو قبول کئے بغیر اسے سچ تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ جب کسی وجہ سے سائنس کا کسی منھاج کے مابعد الطبیعیاتی حقائق پر سے ایمان ختم ہوجاتا ہے تو اس کی جگہ ایک دوسری منھاج لے لیتی ہے جو نئے قسم کے ایمانیات پر مشتمل ہوتی ہے معلوم ہوا کہ ہوسائنسی علم ایک خاص قسم کی ساخت (Structure) کے ماتحت آگے بڑھتا ہے۔

نظریہ ساخت اور لے کاٹوش اور کوھن:

سائنس کے ساختی نظریے کی دو توجیہات پیش کی گئی ہے ایک لے کوٹوش کا نظریہ ریسرچ پروگرام (Research Pvogramme) اور دوسرا کوہن (Thomas Kuhn) کا نظریہ پیراڈائم (Paradigm) ان نظریوں اور ان علمائے سائنس کے مطابق کسی منہاج کو چند الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

لہذا کوئی تحقیقی کام کسی مضمون کی خاص پیراڈیم یا (Hard Core) کو استعمال کئے بغیر ماہرین کے ہاں مقبول نہ ہوگی۔ چنانچہ سائنسی تحقیق کا مقصد واقعات وحوادثات کی ایسی تشریح اور توضیح کرنا ہوتا ہے، جو اس خاص پیراڈائم (مہناج) سے مطابقت رکھتی ہو،

اسے نارمل سائنس کہا جاتا ہے، نارمل سائنس میں پیراڈائم پر تنقید و جرح کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ مختلف قسم کے اضافی مفروضات اور تحقیقی طریقوں کی مدد سے پیراڈائم کو مشاھدات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لے کاٹوش اس قسم کے رضافی مفروضوں کو (Pratective Belts) کہا جاتا ہے جن کا مقصد پیراڈائم کو بچانا ہوتا ہے، چامرایک سائنسی مفکر کی زبان میں لے کاٹوش کا موقف سنیئے:

2. Lakafors,s research Programmes

The remainder of the chapter will be devoted to a summary of one motable attempt to analyze theories as organized structures, Imre Lakatos,s "Methodology of Scientific Research Programmes". Lakatos develped his picture of science in an attempt to improveon, and ovrcome the objections to, Popperian falsificationism.

A. Lakatosian research programme is a structur that provides guidance for future research in both a positive and a negative way. The negative heuristic of a programme involves the stipulation that the basic assumptions underlying the programme, its hard core, must not be rejected or modified. It is protected from falsification by a protective belt of auxiliary hypotheses, initial conditions, etc,The positive heuristic is comprised of

rough giudelines indicating how the research programme might be developed. Such development will involve supplemenfing the hard core with additional phenomena in an attempt to account for prevjously known phenomena and te predict novel phenomena. Research programmes will be progressive or degenerating depending on whether they succeed in leading or whcther they persistently fail to lead to the discovery of novel phenomena. Lest the reader be discouraged by this barrage of new terminology, let me hasten to explain it in fairly simple terms.

[wath is this thing called Science Page 80]

ساختی نظریہ سائنس کے مطابق کسی سائنسی علم کے ماہرین جب ایک پیراڈیم کو چھوڑ کر کسی دوسری پیراڈیم کو اختیار کرتے ہیں تو ان کے پاس اس کی کوئی عقلی دلیل اور معروضی توجیہہ نہیں ہوتی، جو آفاقی ہو، بعض کے نزدیک کسی پیراڈیم کی سادگی (Simpilicity) بعض کے نزدیک اس کی حقیقت پسندی (Realism) بعض کے خیال میں اس کی معاشرتی مسائل کے ساتھ ہم آہنگی، بعض کے ہاں اس کی خاص قسم کے مسائل حل کر سکنے کی صلاحیت وغیرہ ان کی تبدیلی کا سبب ہوتی ہے، لہذا اس بات کا فیصلہ کرنا کہ کونسا معیار کتنی اہمیت کا حامل ہے، عقلاً ممکن نہیں، کسی بھی پیراڈیم کے ماہرین کا کثیر تعداد میں ایک پیراڈیم اختیار کرنا کسی منطقی یا عقلی دلیل کی بنیاد پر نہیں بلکہ خاص قسم کی معاشرتی، ثقافتی تبدیلیوں کے پس منظر میں ہی سمجھا جا سکتا ہے، جو کسی

خاص معاشرے میں کسی خاص پیراڈیم کے بحران کے وقت پیش آتی ہے ساختی علماء سائنس کے نزدیک اس قسم کی نظریاتی تبدیلی جب کثیر تعداد میں رونما ہوتی ہے تو اسے (Scientifc revolution) کے نام سے یاد رکھا جاتا ہے، اس قسم کے انقلاب کے بعد پرانے پیراڈیم کے اکثر ماہرین اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں، جبکہ چند ارباب فکر ونظر پھر بھی اس سے چمٹے رہتے ہیں جنہیں سائنسدانوں کی فہرست سے خارج کردیا جاتا ہے، یا وہ فلسفے کے شعبے میں داخلہ لے لیتے ہیں، جہاں وہ اخر کار مر جاتے ہیں، چامر بیان کرتا ہے:

> A scientific revolution corresponds to the abandonment of one paradign and the adoption of a new one, not by an individual scientist only but by the relevant scientific community as a whole. As more and more individual scientists, for a variety of reasons, are converted to the new paradigm There is an "increasing shift in the distribution of professional allegiances". If the revolution is to be successful, then this shift will spread so as to include the majority of the relevant scientific community, leaving only a few dissenters. These will be excluded from the new scientific community and will prehaps takes refuge in a philosophy department. In any case, they will eventually die.

(۴) فرقہ انارکسٹ: (Anarchists)

فرقہ انارکسٹ وہ فرقہ ہے جو سائنسی علم کو کسی خاص ڈھانچے کا پابند نہیں مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کسی خاص سائنسی طریقے سے حاصل ہونے والی معلومات کو کسی دوسرے طریقہ سے حاصل ہونے والی معلومات پر فوقیت دینے کے لئے کوئی عقلی دلیل نہیں ہوسکتی، مزید یہ کہ مغرب میں سائنسی معلومات کی برتری کا راز خود سائنس کے طریقے کے تجزیئے سے نہیں بلکہ ان معاشرتی وتہذیبوں تبدیلیوں کے پس منظر میں ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

فیئر ابینڈ (Feyreabend) انارکسٹ مکتب فکر کا ترجمان:

اگر ایک راسخ العقیدہ مسلمان یہ بات کرتا ہے کہ سائنس حقیقی اور اقداری علم نہیں اور وہ سائنس کو نظام (System) ماننے سے انکار کرتا ہے، سائنس کو مغربی استعماریت کے تسلط اور فروغ کا ایک اہم ہتھیار سمجھتا ہے، تو لامحالہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ محض عناد دشمنی اور حسد کے بنیاد پر کہتا ہے لیکن مغربی علماء کی زبان میں ہی سائنس ایک غیر اقداری ،غیر حقیقی علم ہے آیئے فیئر ابینڈ جو کہ ایک مغربی مفکر ہے اس کی زبانی معلو کرتے ہیں کہ سائنس کیا ہے؟

فیئر ابینڈ انارکسٹ مکتب فکر کا ترجمان شمار کیا جاتا ہے فیئر ابینڈ اوراس کے فکر کے علماء اس بات کے قائل نہیں کہ جدید سائنس یا مغربی سائنس کوئی ایسی عقلی طریقہ حصول علم ہے جو دوسرے طریقہ حصول علم سے برتر وافضل ہو۔

سائنس لازماً حصول علم کا ایک طریق ہے، لیکن لازماً بہترین طریقہ نہیں (Not Necessarily the best) اس کے خیال میں سائنس کو ایک طرز زندگی اور علم کے طور پر قبول کرنے والوں نے بغیر جانچ پڑتال کے قبول کرلیا ہے، قبول کرنے والے اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ اس کی حدود کیا ہیں؟ اور اس کے فوائد اور ثمرات کیا ہیں؟ کیونکہ ایسا کرنے والوں نے پہلے سے طے کر رکھا ہے کہ سائنس لازماً تمام علوم سے بہتر

اور افضل ترین علم ہے۔

فیئر ابینڈ اور اس کے ہم نوا علماء سائنس آج کی دنیا میں سائنس کی ریاستی سرپرستی کے بھی سخت مخالف ہیں دنیا بھر میں سائنس کی بے پناہ اور روز افزاں ترقی ریاستی سرپرستی کے باعث ممکن ہوگئی ہے اس کی شب و روز ترقی کو معروضیت کے دائرے میں علمیت کا پیمانہ سمجھ لیا گیا ہے، آج جو چیز سائنٹفک طریقے سے اپنے علم اور دلیل کا اظہار نہ کرے یہ لوگ سرے سے علم ہی نہیں مانتے اگر علم مان لیتے ہیں تو اسے قابل قدر نہیں مانتے، اس غیر علمی یک رخی غیر معقول رویئے کے باعث دنیا خوفناک ترین علمی یکسانیت کی جانب بڑھ رہی ہے، جس کے نتیجے میں وہ لمحہ آ جائے گا، جب دنیا میں حقیقت کو پہچاننے کا کوئی دوسرا متبادل طریقہ باقی نہ رہے گا، صرف سائنسی ذریعہ علم ہی، حقیقت کی پہچان، شناخت اور تصور کا واحد طریقہ کار بن جائے گا، جبکہ حقیقت میں سائنسی علم حقیقت کو پہچاننے کا واحد طریقہ قطعاً نہیں ہے، اس میں ہمہ وقت امکان کذب و تردید موجود ہے، سائنس کی ریاستی سرپرستی کی وجہ سے ایک امریکی کو تو مذہب تبدیل کرنے کی مکمل آزادی ہے، لیکن اگر یہی امریکی اپنے بچے کو اسکول میں داخل کروادے اور وہ چاہے کہ میرا بچہ سائنس کا مضمون نہ پڑھے تو قطعاً اس کو اس بات کی اجازت نہ ہوگی، فیئر ابینڈ کا نقطہ نظر چامر کی زبانی سنیئے۔

From Feyerabend,s point of view the institutionalization of science in our society is inconsistent with the humanitarian attitude. In schools, for example, science is taught as a matter of course. Thus, while an American can now choose the religion he likes, He is still not permitted to demand that his children learn magic rather than seicnce at school there is a separation between state and

Church, there is no separation between state and science". What we need to do in the light of this, writes Feyerabend, is to "free society from the strangling hold of an ideologically petrified science just as our ancestors. freed us from the strangling hold of the One True Relgion!" In Feyeraband's image of a free society science will not be given preference aver other forms of knowledge or other traditions. A mature citizen in a free society is a person who has learned to make up his mind and who has then decided in favour of what he thinks suits him best". Science will be studied as a historical phenomenon "together with other fairy tales such as the myths of 'primitive' societies" so that each individual "has the information needed for arriving at a free decision". in Feyerabend's ideal society the state is ideologically neutral its functions is to orchestrate the struggle between ideologies to ensure that individuals maintain freedom of choice and do not have an ideology imposed on them against their will.

[what is this thing called Science Page 142,143.]

اس کے خیال میں سائنسی نتائج وثمرات سائنس کی عظمت کی دلیل مہیا نہیں

کرتے کیونکہ تمام سائنسی نتائج غیر سائنسی عناصر پر انحصار کرتے ہیں۔

And the result of science don't prove its excellence, since these results have often depanded on the presence of non scientific elements.

فیئر ابینڈ نے سائنس کے بارے میں خواہ مخواہ قائم مرعوبیت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کی کتاب (Against method) نے سائنٹفک میتھڈ پر نقد کے ذریعے علم کی دنیا میں زلزلہ برپا کر دیا تھا اور سائنس کی حقیقت کھول کر رکھ دی تھی۔ اس کتاب میں اس نے سائنس کے بارے میں خود ساختہ عقائد نظریات پر تابڑ توڑ جملے کیے ہیں وہ سائنس اور دیگر علوم میں فرق محسوس نہیں کرتا۔

1. Anything goes

Feyerabend makes a strong case for the claim that none of the methodologies of science that have so far been proposed are successful. The main, although not the only, way in which he supports his claim is to show how those methodologies are incompatible with the history of physics. Many of his arguments against the methodologies which I have labelled inductivism and falsificationism resemble those that appear in the earlier chapters of this book. Indeed, the views expressed there owe some debt to Feyerabend's writings. Feyerabend convincingly argues that methodologies of science have failed to provide rules adequate for guiding the activities of scientists. Furthermore, he

suggests that, given the complexity of history, it is most implausible to expect that science be explicable on the basis of a few simple methodological rules. To quote Feyerabend at some length.

The idea that science can, and should, be run according to fixed and universal rules, is both unrealistic and pernicious, It is unrealistic, for it takes too simple a view of the talents of man and of the circumstances which encourage, or cause, their development. And it is pernicious for the attempt to enforce the rules is bound to increase our professional qualifications at the expense of our humanity. In addition, the idea is detrimental to science, for its neglects the complex physical and historaicl conditions which influence scientific change. It makes science less adaptable and more dogmatic.....

Case studies such as those reported in the preceding chapters speak against the universal validity of any rule. All methodologies have their limitation and the only "rule"that survives is "anything goes".

[what is this thing called Science Page 134-135]

وہ سائنس جس کے بارے میں مغربی مفکرین خود یہ اقرار کرتے ہیں کہ سائنسی نظریات کوحقیقت جاننے کا عمل تصور کرنا محض غلط فہمی ہے اور ہر مرتبہ یہ افسانوی حقیقت بدلتی چلی جاتی ہے لیکن مسلم تجدد پسند مفکرین اور خاص کر ذاکر نائیک صاحب اس کو حقیقی اور ثابت شدہ حقائق سے تعبیر کرتے ہیں اور ہر وقت مذہب اور قرآن کو سائنس پر پرکھنے اور جانچنے کی دن رات کوشش کرتے رہتے ہیں، جو کہ ایک غیر علمی غیر اخلاقی رویّہ ہے اگر ذاکر نائیک صاحب نے فیئر ابینڈ کو پڑھا ہوتا تو پھر وہ کبھی بھی سائنس کی اسلام کاری میں مبتلا نہ ہوتا لیکن افسوس کہ ان سب چیزوں سے لاعلم ہو کر بھی اس چیز کی اسلام کاری میں مبتلا ہے جس کا انحصار سراسر کفر پر ہے۔

سائنس اور مفروضات:

قیاس گمان، مفروضات، اندازوں کے ذریعے سائنس کا سفر آگے بڑھتا ہے کوئی سائنس دان سائنسی نتائج کو قطعی، حتمی تسلیم نہیں کرتے سائنسدان کہتے ہیں کہ ہم ایک وقت میں سب کچھ نہیں جان سکتے ہیں ہم ایک وقت میں مادہ کا مقام جان سکتے ہیں یا اس کی رفتار اسی طرح تمام سائنسی نظریات، تجربات کے بعد قائم نہیں کرتے بہت سے سائنسی نظریات، قیاس گمان، وجدان اور اندازے پر قائم کئے جاتے ہیں جیسا کہ (Yukawa) نے مختلف ذرات کے بارے میں پیش گوئی کی تھی جو پوری ہوگئی مشاھدات اور تجربات ہونے کے بعد بھی کوئی یہ صلاحیت نہیں رکھتا ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ یہ ٹھیک ہے یا غلط اس صدی کا آئن اسٹائن R.P فائین مین کے الفاظ اس طرح ہیں:

> So we are stuck with a Theory, and we do not know whether it is right or wrong. but we do know it is a litlle wrong, or at least incomplete. [Six Easy peices. page 39]

اس بحث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بڑے بڑے سائنسی نظریئے پہلے صرف مفروضات کی سطح پر ہوتے ہیں تجربات اور مشاھدات کے نتائج کے بنیاد پر اخذ نہیں کئے

جاتے جیسے آئن اسٹائن کا نظریہ اضافیت ۱۹۱۳ء میں منظر عام پر آیا تھا اور اس کی تصدیق وتائید ۱۹۱۹ء میں ہوئی تھی، مفروضات، قیاس، وجدان اور گمان سے بڑے بڑے نظریئے وجود میں آتے ہیں اور بعد میں اس کی تصدیق وتوثیق ہوتی ہے لہذا سائنس کو کیسے حقیقی علم کہا جاسکتا ہے خود مغربی سائنس دان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ہمارے متجددین اور خاص کر ذاکر نائیک صاحب کو یہ بات سمجھ میں نہیں کہ سائنس کیا ہے؟ ایک ایسا علم جس کی نہ تردید ممکن ہو اور نہ تصدیق کیا علم کہلا سکتا ہے؟ کیا سائنس سرمایہ داری کے بغیر دوڑ سکتی ہے؟ اگر ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو پھر کیوں ڈاکٹر ذاکر نائیک اس علم کو اقداری، العلم اور الحق اور ہر چیز کے پرکھنے اور جانچنے حتیٰ کہ قرآن اور مذہب جیسے مقدس چیزوں کو پرکھنے کا پیمانہ سمجھتا ہے یقیناً ایسا کرنا لاعلمی کا نتیجہ ہے۔

سائنس کی مبالغہ آمیز اہمیت:

سائنس کی برتری کے مدعی یہ بھی کہتے ہیں کہ صرف سائنس ہی انسان پر حیات وکائنات کے سربستہ راز منکشف کرسکتی ہے اس لئے حقیقت اور صداقت وہ ہے جس کی تائید سائنس کرے باقی سب خرافات اور دفتر بے معنی ہے اپنے جوش بیان میں یہ حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ سائنس ہنوز اپنے ابتدائی دور میں ہے کیونکہ اس کی معلومات ناقص اور ناقابل اعتبار ہیں۔ اس کا دائرہ کار محدود ہے اس کا مشاہدہ سطحی ہے اور اس میں صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ حقیقت کی تہہ میں اتر سکے سائنسدانوں کے نزدیک اپنے حواس کی حدود کو پھلانگ کر کوئی انسان پردہ غیب میں مستور دنیا سے اپنا رشتہ استوار ہی نہیں کرسکتا خواہ یہ رشتہ عالم خواب میں قائم ہو یا انتقال خیال Telepathy اس کا واسطہ بنے، جدید دور میں روح کے وجود سے انکار کی بنیاد کسی تجربے یا مشاہدے پر ہرگز نہیں بلکہ اس کی بنیادی وجہ تجرباتی سائنس اور اس کے ناکافی اور غیر موزوں ہونے پر ہے غالباً مشیت ایزدی کے نزدیک ان اعلیٰ حقائق کو انسانی ادراک کی براہ راست گرفت سے باہر رکھنا ہی حکمت ومصلحت کا تقاضا تھا مگر کم فہموں کے لئے یہی بات ضلالت اور

انکار کا باعث بن گئی وہ بزعم خویش یہ سمجھ بیٹھے کہ دنیا میں روح کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے اس کے علاوہ جدید یورپی سائنس دان سائنس کی کامرانیوں کو کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ گویا یہ انسان نے کسی برتر قوت سے لڑ کر حاصل کی ہے اور اس کے نتیجے میں فطرت کی قوتوں کو تابع بنالیا ہے الغرض یہ وہ ''علمی جہالت'' ہے جس میں دور جدید کا انسان مبتلا ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس بات کی کتنی ضرورت ہے کہ لوگوں کو جدید خرافات سے نکالا جاسکے جو آج کل سائنس پرستی کی شکل میں موجود ہے۔

انسان جس کو سائنس دریافت نہ کرسکی:

جدید علماء سائنس طویل تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سائنسدانوں کی عقل وفکر حقیقت انسانی کے ادراک میں بے بس اور ناکام ثابت ہوئی ہے کیونکہ انسان کے جسم میں حیاتیاتی مظاہر گویا ایک طلسماتی جنگل ہیں جہاں رنگ برنگ کے بے شمار درخت مسلسل طور پر اپنی جگہ اور اپنی شکل بدلتے رہتے ہیں۔

چنانچہ فرانس کے ایک بڑے نامی گرامی کاریل نے پوری ایک کتاب ''نامعلوم انسان'' کے نام سے لکھ ڈالی کہ انسان نے گو بے شمار علوم وفنون کے کتب خانے بھر ڈالے ہیں لیکن خود یہ یا اس کی انسانیت ہے کیا؟ اس سے جاہل ہی چلا جاتا ہے، اس طرح ایک اور بڑے عالم سائنس نے ایک ضخیم کتاب ''سائنس کے ناحل مسائل'' پر لکھ ڈالی اس میں بھی سائنس کا سب سے ناحل مسئلہ انسان کو قرار دے کر کہا کہ

> سائنس دان کسی بحث ومسئلہ میں اس سے زیادہ عاجز ودرماندہ نہیں جتنا خود انسان کے معاملے میں: وہ ایٹم کو توڑ سکتا ہے بعید سے بعید ستاروں کی روشنی کی تحلیل وتجزی کرسکتا ہے وہ بجلی کو غلام بنا سکتا ہے لیکن یہی سائنسدان جب زندگی کی حقیقت اور اس سے بڑھ کر خود اپنی یا انسان کی حقیقت سمجھنا چاہتا ہے تو مشکلات ہی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے۔

[مذہب اور سائنس ص: ۵۱، ۵۲]

جدید سائنس کے نقصانات:

جدید فلسفہ اور جدید سائنس جس کی بنیاد ہی مذہبی قیود کی آزادی پر رکھی گئی ہے ایک مدّت سے بڑی آزادی کے ساتھ پھلنے پھولنے کے بعد اپنے ثمرات وبرکات دنیا کو دے رہی ہے آیئے اس چلتی پھرتی دنیا کا ایک سرسری نگاہ میں جائزہ لے لیں۔

سائنس کی نت نئی ایجادات اور انکشافات انسان کا فائدہ کم اور نقصان کا زیادہ موجب بن سکتی ہے ہاتھ سے کام کرنے کے بجائے اگر انسان مشین سے کام کرنے لگے ، جانوروں پر سفر کرنے کے بجائے اگر ریل ، موٹر اور بحری وہوائی جہازوں میں دوڑنے لگے ۔ ڈاک چوکیوں کے بجائے اگر آج موبائل فون ٹیلیفون اور انٹرنیٹ پر خبر رسانی ہونے لگی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان پہلے سے زیادہ خوشحال ہوگیا ان چیزوں سے اس کی جس قدر اس کی خوشحالی بڑھ سکتی ہے اسی قدر بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ اس کی مصیبت ، پریشانی اور تباہی بڑھ سکتی ہے، آج جنگی سامان ، راکٹ ، ایٹم اور ہائیڈروجن بم اور ایسے ایسے آتشیں سامان جنگ وجود میں آچکے ہیں کہ اب اگر انسان چاہے تو چند گھنٹوں میں اپنے مسکن یعنی اس کرہ ارض کو مخلوق سمیت عدم کی راہ دکھا سکتا ہے پھر تمدن کے نئے نئے مسائل اور نئے نئے حالات سامنے آنے کی وجہ سے مختلف قسم کے نئے علوم ، نئے قوانین حیات ، نئے ضوابط سیاست جہانبانی ، نئے اصول تجارت اور نئے انداز کاروبار بھی ایجاد ہوگئے ہیں ، ان تمام نئے اسباب ووسائل اور نئی ایجادات ومصنوعات کی اتنی افراط وبہتات کی حالت میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خود حضرت انسان اب کس حال میں ہیں اس مشینی دور میں کیا ایسا تو نہیں ہے کہ خود انسان بھی کمانے ، کھانے اور اڑانے کی ایک مشین ہی بن کر رہ گیا ہے ہر وہ انسان جس کے چہرے پر دو آنکھیں ، سینے میں دل اور سر میں دماغ موجود ہے وہ دیکھ اور سمجھ سکتا ہے کہ مصنوعات اور سامان آرام وآسائش کی کثرت کی بدولت آج انسان کا یہ حال ہے کہ وہ ختم نہ ہونے والی نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات کا غلام بن کر قلبی سکون اور روحانی طمانینت کو کھو بیٹھا ہے، پہلے

ادوار میں جب کہ طرز زندگی اور فیشن ایک عرصہ کے بعد بدلا کرتے تھے اب نئے نئے سامان مہیا ہونے کی وجہ سے ہر لحظہ بدلتے رہتے ہیں۔

انہیں سائنسی ایجادات کی وجہ سے انسان آج اصلی دودھ، گھی اور انڈوں سے محروم ہے، البتہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے گھی، دودھ، پنیر اور دہی دستیاب ہیں جس کے بارے میں ہم بالکل نہیں جانتے کہ اس میں خالص حصہ کتنا ہے؟ اور ملاوٹ کتنی؟ لیکن کاروباری حلقوں کو معلوم ہے کہ رفحان کمپنی سے سب سے زیادہ نشاستہ نیسلے، حبیب آلپرز اور دودھ کی تمام کمپنیاں خریدتی ہیں اور اسے دودھ کو گاڑھا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لیکن اسی ملاوٹ شدہ دودھ کو خالص دودھ کے طور پر فروخت کیا جاتا ہے سائنس وٹیکنالوجی کے کمالات کے باعث نقلی دودھ اصلی نظر آتا ہے، لوگ اس زہر کو استعمال کرتے ہیں ایسا زہر جس کی قیمت زیادہ ہے جس میں نہ بالائی ہے نہ لذت، نہ خوشبو ہے اور نہ ذائقہ جس میں زہریلے کیمیائی مادے استعمال ہوتے ہیں جسے اتنے اونچے درجہ حرارت پر گرم کیا جاتا ہے کہ اس میں کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا۔

تاریخ انسانی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ لوگوں کو نیند نہ آئی ہو سونے کے لئے گھر سے باہر (Sleeping centers) سونے کی دکانوں میں جانا پڑا ہو۔ یورپ میں لوگوں کو نیند نہیں آتی لہذا ان کی خدمت کے لئے ملٹی نیشنل کمپنیوں نے سونے کی دکانیں کھول رکھی ہیں جہاں پیسے دے کر سو جائیے وہ کونسی تہذیب ہے؟ اس کا کیا نظام اور اقدار ہے؟ کہ لوگ اپنے گھر کے بستروں کے بجائے بازار میں سونا چاہتے ہیں۔

امریکہ یورپ میں تازہ ہوا لینے کے لئے (Fresh air Parlour) کھل گئے ہیں پیسے دیجئے اور ہوا لیجئے۔

سائنس وٹیکنالوجی کی بدولت بے پردگی، عریانی، سینما اور تھیٹر کی زندگی اور محرک اشیاء شراب وغیرہ کے استعمال سے انسان کے شہوانی جذبات حد اعتدال سے زیادہ برانگیختہ ہونے لگے، جس کے نتیجے میں صحت اور اعتدال مزاج سے ہاتھ دھونا پڑا پھر طرح طرح کی بیماریاں اور پھر ہسپتالوں اور علاج معالجوں کے جکڑ نے انسانی زندگی کو مفلوج

بنا رکھا ہے کسی بالا و برتر طاقت کے سامنے جوابدہی کے احساس کے فقدان کی وجہ سے ہر معاملہ اور زندگی کے ہر موڑ پر افراط و تفریط کی راہ اختیار کرلی گئی ہے، یہ بات ہر شخص سمجھتا ہے کہ جس وقت خواہشات و جذبات کا سمندر موجزن ہو، اسباب مہیا ہوں، کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو، تو ایک عقلمند سے عقلمند اور زیرک سے زیرک انسان کس حد تک جا پہنچتا ہے، چنانچہ یورپی ممالک میں مرد و زن کے آزادانہ اختلاط اور ساتھ ساتھ تعدد ازدواج پر پابندی کی وجہ سے ایک طرف تو نکاحوں اور طلاقوں کی بھرمار ہے خاندانی نظام تباہ ہوکر رہ گیا ہے اور دوسری طرف باہمی اعتماد اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا سکون ختم ہو گیا ہے۔ آخر میں سوال ضروری ہے کہ کیا ایسی تہذیب جس میں چاروں طرف گمراہیاں ہی گمراہیاں ہوں اس کو اسلامی کہنا اور اس کی ترقی کو اسلام کا مطلوب ہدف کہنا کیا درست ہے؟

ماحولیاتی تباہی اور سائنس و ٹیکنالوجی:

سائنس اور ٹیکنالوجی نے جہاں نت نئی ایجادات عطاء کی ہیں اور صنعتی سرگرمیوں نے بے پناہ ترقی کر کے انسان کو اس کی ضروریات مہیا کی ہے وہاں ان ایجادات نے انسان کو نفسیاتی امراض میں مبتلا کیا ہے اور بہت سے تباہ کن نقصانات بھی پہنچائے ہیں صنعتی ترقی زمین کے درجہ حرارت میں تیز رفتار اضافے کا سبب بن رہی ہے جو محض چند دہائیوں میں دنیا آگ کی بھٹی میں تبدیل کردی گئی یہ سب کچھ ان نئی مصنوعات (Products) کی استعمال کی وجہ سے ہے جس کی وجہ سے ہر فرد انفرادی لذت حاصل کرنے اور دنیا کو جہنم میں تبدیل کر رہا ہے گزشتہ کئی سالوں سے کاربن ڈائی آکسائیڈ (Co^2) اور گرین ہاؤس گیسز (Green house Gases) برف پگھلنے کے باعث خارج ہوکر فضاء میں شامل ہو رہی ہے اور گلوبل وارمنگ میں مسلسل اضافہ کر رہی ہے کئی ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر آئندہ پچاس برس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج کے عمل کو کم نہیں کیا گیا تو تباہی پھیل جائی گی۔

اسی ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے آرٹک اور انٹارکٹیکا کی برفانی تہیں اور گرین لینڈ کے علاقوں میں برف مسلسل پگھل رہی ہے ماہرین کے جس سے مطابق ۲۰۵۰ تک دنیا کے ہزاروں شہر ڈوب جائیں گے، تو دوسری طرف عالمی جنگ بھی پانی کے حصول کے لئے لڑی جائے گی۔

پرسٹن یونیورسٹی کے بین الاقوامی تعلقات اور ارضی علوم کے پروفیسر (Micheal Oppenheimer) جو کہ (Advocacy Group Environment Defence) کے مشیر ہیں کا کہنا ہے سب سے شدید خطرہ گرین لینڈ اور مغربی انٹارکیٹکا کی برفانی تہوں (Sheets) کا انتشار ہے جو کہ کرہ ارض کے تازہ پانی کا ۲۰ فیصد ذخیرہ اپنے اندر رکھتا ہے اس کا کہنا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی سی دو تہیں (Sheets) بھی منتشر ہوئیں تو اس کے نتیجے میں سطح سمندر میں بیس فٹ اضافہ ہونے کا خدشہ ہے جو کہ دو صدی کے عرصے میں فلوراڈ کے شمالی حصہ اور مین ہیٹن کو گرین وچ دیہات تک غرق کر دے گا۔

> One of the Greatest dangers lies in the disintegration of the Green land. on west Antarctic ice sheets, which together hold obout 20 per cent of the fresh water on the planet, if either of the two sheets disintegrates, sea level could rise nearly 20 feet in the course of a couple of centuriest, swamping the southern Third of Florida and manhattan up to the middle of Green wich village.

ریفریجیٹر اور ائیر کنڈیشنڈ جو آج کل ہر گھر کی ضرورت ہیں اور ہر آدمی اس کو استعمال کر کے محظوظ ہو رہا ہے لیکن اس ریفریجیٹر کے ذریعے فضاء میں (Chlorof lurocarbons) کی دو سو سال تک مسلسل پھیلنے والی آلودگی نے اوزون کی اس لہر کو

توڑ دیا، جو پوری دنیا کو سورج کی خطرناک شدت وحدت سے بچاتی تھی دو صدیوں تک چند فی صد امیر لوگوں نے ائیر کنڈیشنڈ سے مصنوعی ٹھنڈک کے مزے اٹھائے اور پوری دنیا کی اکثریت کو خطرناک گرم موسموں کے سپرد کر دیا اور آج جو دن بدن گرمی کی حدت اور شدت میں اضافہ ہو رہا ہے اسی اُوزون (ozone) کی لہر توڑنے کی وجہ سے ہے، جو ان مصنوعی ذیوں نے ممکن بنایا ہے، ہمارے جدید مفکرین صرف سائنس کی نت نئی ایجادات کو دیکھ کر اس سے مرعوب ہوتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ سائنس نے کیا کر دکھا یا ماحول میں عدم توازن کے باعث ہولناک نتائج واثرات کی ذمہ دار صرف اور صرف سائنس ہی ٹھہرائی جا سکتی ہے بعض اوقات سائنسی تحقیقات کی بدولت بعض ایسے نتائج واثرات رونما ہوتے ہیں جو سائنسدانوں کے چشم تصور تک میں نہیں ہوتے Ravetz کے بقول:

''مخلص ترین سائنسدان تک بھی ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں جس کا انہیں اب احساس ہو رہا ہے یہ غلط فہمی عام تھی کہ سائنس سرتا سر خیر ہے اور اس سے کسی نقصان کا احتمال نہیں عرصہ دراز سے یہ مفروضہ بلکہ عقیدہ مقبول رہا ہے کہ سائنس خیر سے عبارت ہے یہ تصور سترھویں صدی سے مقبول ومعروف ہے فرانس بیکن کے مطابق جادو اور سحر پر عقیدہ ہونا محض گناہ ہی نہیں بلکہ یہ عقیدہ اس لحاظ سے بے بنیاد اور گمراہ کن بھی ہے کہ انسان بغیر کسی مشقت کے کسی شے کا مالک ہو جاتا ہے درحقیقت جادو اور سحر کی مدد سے انسان واقعۃً کوئی شئے نہیں کرتا، اہل مغرب کے تصور کائنات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی مقبول ہوتا گیا کہ سائنس قطعاً غیر نقصان دہ ہے اور اس سے کسی قسم کا خطرہ نہیں لاحق ہو سکتا اس خیال کی بنیاد اس فکر پر تھی کہ سائنس سے حاصل ہونے والے نتائج ہمیشہ معروف علتوں کے باعث ہوں گے لہذا کسی نقصان کا خدشہ نہیں ہے، سائنسدانوں کے ہاں ماحول میں عدم توازن واقع ہونے

کے نتیجے میں پیدا ہونے والے لاتعداد مسائل کا سرے سے کوئی اندازہ ہی نہیں تھا، جنگ عظیم کے بعد کے دور میں یہ سنگین غلطی سائنسدانوں پر منکشف ہوئی ہے، چونکہ سائنس کے نقصان دہ یا خطرناک ہونے کا ابتداء میں کوئی تصور ہی نہ تھا اس لئے آج مسائل اس قدر سنگین ہوگئے ہیں اور آج بنی نوع انسانیت اپنے وجود کے بقاء کی جدوجہد میں مصروف ہے۔''

کسی تحقیق کے نتیجے میں برآمد ہونے والے قابل تصور نتائج سے ہم اپنے آپ کو بری الزمہ نہیں قرار دے سکتے کیونکہ تجسس اور تحقیق کے نام پر آج دانستہ طور پر غیر اخلاقی انداز میں مطالعات کئے جاتے ہیں، مغربی سائنس کے تباہ کن اثرات کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس پر کوئی اخلاقی پابندی نہیں ہے یہ تصور کہ سائنس خالصتاً نیک عمل ہے اتنا احمقانہ ہے جتنا کہ یہ تصور کہ تحقیق کی بدولت سائنسدان تزکیہ نفس کے اہل ہوجاتے ہیں، آج جب کہ سائنس پر نہ کوئی اخلاقی پابندی ہے اور نہ اس ضمن میں کسی تنقید کو برداشت کیا جاتا ہے اس ضمن میں ہم یہ بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ کس بری طرح مٹھی بھر سائنس کے شکنجے میں کسا ہوا ہے۔

اس غیر حقیقت پسندانہ رویے، ماحولیات کے عدم توازن، اخلاقیات کے فقدان اور منظّم اداروں کی موجودگی کے باعث مغربی سائنس نے ایک خونخوار درندے کا قالب اختیار کرلیا ہے، سائنس کی اپنی مخصوص حرکیات (Dynamics) کی بنیاد پر وہ کسی بھی معاشرے کو یکسر تبدیل کردینے پر قادر ہے، سائنس کی اس روش کے پیش نظر غیر مادی اقدار پر استوار کسی معاشرے کا وجود اور بقاء اب ناممکن ہوگیا ہے اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو زمین پر انسان کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا، علم اور تحقیق کے نام پر پیدا ہونے والی آگ بھیانک انداز میں ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے کر خاکستر کردے گی۔

جدید سائنس: عالم اسلام میں فروغ ممکن نہیں:

کسی بھی مذہبی معاشرے میں ایٹم بم جیسا خطرناک ہتھیار جوارض وسماء میں تباہی

پھیلا دے کبھی ایجاد نہیں ہوسکتا، کیونکہ اسلام کا مقصد لوگوں کو ہلاک کرنا نہیں بلکہ حقیقی ہلاکت یعنی جہنم سے بچانا ہے اور لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنا ہے ہلاک صرف اسے کیا جاتا ہے جو ہلاکت کا حقدار ٹھہرتا ہے لیکن سائنس وٹیکنالوجی کی مدد سے بنائے گئے بم مغرب بغیر کسی دلیل اور ہلاکت کی وجہ کے افغانستان، وزیرستان اور عراق میں بے گناہ لوگوں پر برسا رہا ہے ایسی سائنس وٹیکنالوجی جس کے ذریعے بربریت اور ظلم کے ساتھ بوڑھے، جوان، بچے، اور عورتیں بغیر کسی تمیز کے قتل کئے جاتے ہیں، ایسی سائنس وٹیکنالوجی کی عالم اسلام میں فروغ ممکن نہیں کیونکہ وحی الٰہی اور اسلامی تہذیب ایسے بے گناہ قتل عام اور بربریت کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتی یہ تو مغرب کا وطیرہ ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر مغرور ہیں اور بے گناہ لوگوں کو مسلسل دنیا کے مختلف اطراف میں بربریت اور ظلم کے ساتھ قتل کر رہے ہیں لہذا مذہبی معاشروں میں کبھی مادہ پرست سائس کو فروغ نہ مل سکا کیونکہ جدید سائنس ایک مخصوص تصور کائنات سے وابستہ معاشرے ہی کی ضروریات پورا کرنے پر قادر ہے اس سائنس کا اصل مقصود مغربی تمدن کو غالب کرنا ہے اس لئے جدید سائنس کا مسلم معاشرے میں فروغ ممکن نہیں کیونکہ یہ مسلم ثقافت وتمدن کے تقاضوں کو ہرگز پورا نہیں کرسکتی۔

ایک گزارش:

ان سب مباحث کے بعد عقل وانصاف اور خیر خواہی کا تقاضہ یہ ہے کہ اس وقت نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ مغربی دنیا سمیت سب بنی نوع انسان کو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی آخری ہدایت یعنی اسلام کی راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا جائے کیونکہ سائنس جدید اور مغربی تہذیب نے دنیا کو صرف ایک ہی چیز دی ہے یعنی انسان کی مادی احتیاج کی کفالت، لیکن وہ بھی ہدایت الٰہی کے تابع نہ ہونے کی وجہ سے فائدہ مند ہونے کے بجائے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے یہ مادی سامان دو قسم کے ہیں اسباب عیش اور اسباب ہلاکت اور دنیا کی تاریخ پر نظر رکھنے والا ہر عقلمند انسان اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے

کہ دنیا کی طویل تاریخ میں ایسا بارہا ہوا ہے کہ جو قوم بھی عیش وعشرت میں غرق ہوئی وہ اسباب ووسائل کی کثرت کے باوجود دنیا سے بہت جلد نیست ونابود ہوگئی، پس یہ دونوں قسم کے سامان دراصل تباہی وہلاکت ہی کے سامان ہیں، رہا انسان کی زندگی کا دوسرا پہلو جس کا تعلق انسان کے روحانی تقاضوں اور حیات بعد الموت سے ہے سو اس احتیاج کا کوئی سامان اور اس دکھ کا کوئی دارو سائنس جدید اور تمدن جدید کے پاس سرے سے ہے ہی نہیں، اقوام مغرب کی ساری روشن دماغی، تمام علم وحکمت اور فلسفہ وسائنس کے سارے شاہکاروں کا مصرف انسانی شکم اور نفس کے سوا کچھ نہیں ہے اور اس تمدن کے زیر اثر انسانوں کی زندگی شکمی لذات اور نفسانی خواہشات کے دائرے میں محدود ہو کر رہ گئی ہے لیکن ایک سلیم الفطرت انسان جس کی انسانی فطرت مسخ نہیں ہوئی یہ محسوس کرتا اور سمجھتا ہے کہ انسان کے اندر ایک لطیف چیز یعنی روح بھی ہے جس کے تقاضے بھی بڑے لطیف ہیں اور اس سائنس اور فلسفہ جدید کے علمبردار اور مدعی عقل انسان نے قلب وروح کی زندگی کا کوئی سامان پیدا نہیں کیا ہے اس لئے تمدن جدید کے اس حمام کے ننگوں کو جامہ انسانیت پہنانے کی بڑی ضرورت ہے اور انسانی ہمدردی اور خیر خواہی کا تقاضہ ہے کہ یورپ کے اس پرانے مریض کو کسی حاذق طبیب کے آستانہ پر لاکر ڈال دیا جائے تاکہ اس کا مزاج اعتدال پر آجائے اور اس کے معدہ اور اعصاب کے ساتھ ساتھ اس کے اعضاء رئیسہ قلب وجگر بھی کام کرنے لگ جائیں اور اس کی روح حیوانی ونفسانی کے ساتھ ساتھ اس کی روح انسانی بھی قوی وتوانا ہو جائے۔

المقصد اصولی طور پر سمجھ لینے کے بعد جس کو دنیا وآخرت کی فلاح ونجات کی طلب وضرورت ہو اسے چاہئے کہ اللہ کی مقدس کتاب قرآن مجید کا مطالعہ اس کے شارح یعنی پیغمبر اسلام ﷺ کی احادیث کی روشنی میں کرے اور پھر اس روشنی میں اسلام کے اکابر یعنی صدیقین، شہدا اور صالحین نے جس طرح دنیا میں زندگی گزاری ہے ان کے نقش قدم پر چل کر فائز المرام ہو۔

﴿ وآخر دعوانا الحمد لله رب العالمین ﴾

باب ثانی

مذہب اور سائنس کی کشمکش

مذہب اور سائنس دونوں بہت وسیع الفاظ ہیں مذہب زندگی کا ایک تصور اور اس تصور پر بننے والے ایک ہمہ گیر طرز عمل کا نام ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں اپنے کچھ مطالبات اور تقاضے رکھتا ہے مذہب کا اعتقاد انسانی فطرت کا خاصہ ہے یہ اخلاقی ہدایتوں کا مجموعہ ہے، اس سے خداشناسی کا سبق ملتا ہے مذہب ہی کی تصریحات پر عمل پیرا ہونے سے انسان جلوت وخلوت کے تمام مواقع پر پاکباز بن جاتا ہے، مذہب کی ھدایت کے مطابق انسان ایسی روحانی قوت کا پیروکار رہتا ہے جو اسے معاشرے کی بڑی بڑی برائیوں، ماحول کی جملہ کمزوریوں، ظلم وجور، زیادتی، تجاوز، بے ایمانی، جھوٹ، فریب اور ہر قسم کے اخلاقی عیوب سے مکمل طور پر محفوظ کرتا ہے، ہر سوسائٹی کے مذکورہ عیوب کو کسی مملکت یا اسٹیٹ کا (State) قانون ختم نہیں کرسکتا، کوئی ضابطہ اس کی خواہشات کو ناروالذات کے حصول سے نہیں روک سکتا، کوئی کلیہ اور قدغن اس کی بری تمناؤں کے راستے کی دیوار نہیں بن سکتا، خلوت وجلوت میں پیش آنے والی ہر برائی صرف مذہب وروحانیت کی طاقت سے ختم ہوسکتی ہے۔

اور سائنس اس محسوس دنیا کے مطالعے کا نام ہے جو ہمارے مشاہدے اور تجربے میں آتی ہے یا آسکتی ہے، یہ دونوں نہایت وسیع موضوعات ہیں اور ان کے دائرے ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں، سائنس نے اب خود خدا بن کے مذہب سے اپنا دامن چھڑا لیا ہے اور جدید سائنس کی دریافتوں نے مزعومہ مذہب کو ایک بے بنیاد چیز ثابت کر کے رد کردیا ہے۔

سائنس اور مذہب کا ٹکراؤ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کا پیدوار ہے یہی وہ زمانہ ہے جب جدید سائنس کا ظہور ہوا اور سائنسی دریافتوں کے سامنے آنے کے بعد بہت

سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اب خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں سائنسدانوں نے کہا کہ جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ہم آسانی کے ساتھ پوری کائنات کی اس طرح تشریح کر سکتے ہیں کہ کسی بھی مرحلے میں خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی اسی طرح خدا کا خیال ان کی نظر میں ایک بے ضرورت چیز بن گیا اور جو خیال بے ضرورت ہو جائے اس کا بے بنیاد ہونا لازمی ہے اور یوں مذہب کا خاتمہ ہونے لگا۔

اسی طرح پہلے کلیسا اور سائنس دوستی اور بعد میں سائنس دشمنی بھی مغرب میں مذہب کے خاتمے کا باعث بنی۔

برصغیر میں مذہب اور سائنس کی کشمکش:

مذہب اور سائنس کی کشمکش سوسوا سو سال سے مسلمان اہل فکر کے ذہنوں کو مضطرب کیئے ہوئے ہے وہ ایک طرف سائنس کی بے پناہ قوت کو ترقی کیلیے ضروری بھی سمجھتے ہیں اور دوسری طرف اس سے ڈرتے بھی ہیں چوں کہ وہ دیکھ چکے ہیں کہ مغرب میں سائنس کے ہاتھوں مذہب کا کیا حشر ہوا، لہذا ڈرتے ہیں کہ سائنس کہیں ان کے مذہب کے ساتھ بھی وہی سلوک نہ کرے جو اس نے مغرب میں عیسائیت کے ساتھ کیا، گو ہمارے ہاں دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک اُن لوگوں کا گروہ ہے جو سائنس کی نت نئے انکشافات، ایجادات سے مرعوب ہو کر سائنس کی حق میں ہو کر بھی خوف زدہ ہیں اور دوسرے وہ لوگ جو سائنس کی مخالف ہو کر بھی سائنسی ترقیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں، سائنس کے حق میں ہو یا اس کے خلاف ہمارا رویہ اس کے رد و قبول کی کش مکش سے خالی نہیں ہوتا تاہم پلڑا زیادہ تر سائنس کے حق میں جھکتا ہے اور سائنس کی برکات سے فیض یاب ہونے کے لئے بالاخر بڑی سے بڑی قیمت دینے پر تیار ہو جاتے ہیں خواہ یہ قیمت اپنے مذہب اور اخلاق و اقدار ہی کی صورت میں کیوں نہ چکانی پڑے۔

برصغیر پاک وھند میں سب سے پہلے جھکنے والوں میں سر سید احمد خان کا نام سرفہرست ہے سر سید احمد خان سائنس کے اس طرح قائل تھے کہ انہیں سائنس کی قربان گاہ پر مذہب

کی بھینٹ چڑھانے میں بھی کوئی مضائقہ نظر نہ آیا اور جو چیز سائنس کے تجربے اور مشاہدے میں نہ آسکتی تھی اس کی غلط سلط تاویلات کر کے سائنس کے مطابق بنانے کی کوشش کی ان کی تفسیر قرآن اس کی اس جرأت رندانہ کے نتیجے میں وجود میں آئی یہاں تک کہ جس چیز سے سائنس انکار کرنے لگی سرسید نے بھی ان چیزوں سے انکار کرنا شروع کیا مثلاً وہ اپنی تفسیر القرآن میں فرشتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جن فرشتوں کا قرآن میں ذکر ہے، ان کا کوئی اصلی وجود نہیں ہوسکتا بلکہ خدا کی بے انتہا قوتوں کے ظہور کو اور ان قویٰ کو جو خدا نے اپنی تمام مخلوق میں مختلف قسم کے پیدا کئے ہیں ملک یا ملائکہ کہا ہے۔''

[تفسیر القرآن ۱/٤۹]

اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں لکھتا ہے:

''بے شک ان کے لئے آگ دہکائی گئی تھی اور ڈرایا گیا تھا کہ ان کو آگ میں ڈال کر جلادیں گے مگر یہ بات کہ درحقیقت وہ آگ میں ڈالے گئے، قرآن مجید سے ثابت نہیں۔''

[تفسیر القرآن ٦/۸، ۲۰٦، ۲۰۸]

''کیونکہ خدا نے ہم کو قانون فطرت یہ بتایا کہ آگ جلا دینے والی ہے، پس جب تک یہ قانون فطرت قائم ہے اس کے برخلاف ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ قولی وعدہ کے برخلاف ہونا ناممکن ہے۔''

[تحریر فی اصول التفسیر ٤۰]

اس کے علاوہ اس نے جنت دوزخ اور دیگر معجزات کا انکار کیا کیونکہ یہ چیزیں سائنسی نقطہ نظر سے ٹھیک نہیں تھی۔

سرسید احمد خان کے علاوہ برصغیر پاک وھند میں سائنس کے طرف جھکنے والوں میں شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ اقبال اور علامہ پرویز مشرقی بھی شامل ہیں، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے تو

سائنس کو مسلمانوں ہی کے اسلاف کی متاع گم شدہ قرار دے کر اسے اہل مغرب سے واپس لینے کا مشورہ دیا تھا۔

سائنس صرف مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہے:

سائنس صرف محسوسات، تجربات اور مشاہدات کی بات کرتی ہے مثلا جب کوئی آدمی یہ دریافت کرے کہ پانی کیسے بنا؟ تو اس کے اس سوال سے یہ منشاء ہوگا کہ جواب دینے والا پانی بننے کے واقعے کا تجزیہ کر کے یہ بتلائے کہ جس مرکب کا نام پانی ہے اس کی ترکیب کن عناصر سے ہوئی ہے اور ان عناصر کے باہم ملانے کا طریقہ کیا ہے؟ تو سوال کا یہ منشاء جواب کو واقعات اور ان کے مشاھدے اور ان کے درمیان علت و معلول کے رشتوں کی دریافت تک محدود کر دیتا ہے سائنس صرف محسوسات مشاھدات اور تجربات کی بات کرتی ہے۔

Science is based what we can see and hear and thouch etc.

جبکہ مذہب میں صرف حسی مشاھدہ ہی حقیقی نہیں بلکہ مشاہدہ بصیرت کی آنکھوں سے ضروری ہے تاکہ اس مشاھدے اور تجربے کی بنیاد پر خدا کو پہچانا جائے، یہی وجہ ہے قرآن نے ان لوگوں کو اندھا اور بہرا کہہ دیا جو محسوسات میں الجھ گئے حالانکہ وہ حقیقی طور پر اندھے اور بہرے نہ تھے بلکہ بصیرت اور معرفت خداوندی سے اندھے اور بہرے تھے۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾

ادارک بالحواس کے ہوتے ہوئے اگر معرفت الٰہی کی سعادت سے محروم ہو جائے تو اس کو ہی اندھا اور بہرا ہی کہا جاتا ہے چاہے وہ مادی ترقی کتنا ہی کرے اسی وجہ سے سائنس اندھی اور بہری ہے، جو کسی بھی صورت معرفت خداوندی کے لئے کافی نہیں ہے۔

حسی مشاہدہ فلسفیانہ نقطہ نظر سے:

فلسفیانہ نقطہ نظر سے اور مشہور فلسفیوں کے نزدیک حسّی مشاہدہ نا قابل بھروسہ اور لائق اعتبار نہیں جو لوگ حسّی مشاہدے کے نا قابل بھروسہ ہونے کا تصور پیش کرتے ہیں وہ التباسات، توہمات اور خواب کی دنیا سے مثالیں دے کر یہ بتلاتے ہیں کہ خارجی اشیاء جس طرح وہ ہیں اس طرح ہم کو نظر نہیں آتیں جھلملاتے ستارے، قوس قزح، پانی میں پڑی سیدھی لکڑی جو ٹیڑھی نظر آتی ہے اور اس قبیل کے دوسرے مشاھدے ان لوگوں کے نظر میں اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ حسی علم حقیقت کا غلط نمائندہ ہوتا ہے اگر حسی مشاہدے کا یہ حال ہے تو پھر یہ بات سراسر غلط ہے کہ سائنس حقیقت کا علم عطاء کرتی رہتی ہے۔

مذہب اور ماورائے محسوسات کا تعلق:

سائنس صرف حسی، مشاہداتی اور تجرباتی حقائق سے گفتگو کرتی ہے اور جو چیز مشاہدہ اور تجربہ میں نہ آسکے اس کا انکار کرتی ہے جبکہ مذہب ہزاروں ایسی چیزوں کی بات کرتا ہے جو ماورائے محسوس ہو، محسوس اور غیر محسوس کا یہ فرق ان دونوں کے درمیان تضاد اور تخالف کو نمایاں کرتا ہے مثلاً معجزہ، ملائکہ، روح، جنت، دوزخ، حضرت آدم علیہ السلام کا مٹی سے پیدا ہونا، حیات بعد الممات، خدا، آخرت، وحی، مذہب میں بنیادی عقائد ہیں اور ایک مذہبی آدمی ان سب عقائد کو محسوس نہ ہونے کے باوجود دل و جان سے قبول کرتا ہے، کیونکہ اس کا ایمان ان ہی عقائد کی مرہون سنت ہے، جبکہ سائنس ان سب کا انکار کرتی ہے سائنس کے نزدیک ان میں سے کوئی بھی چیز ایسی نہیں جسے حیات وکائنات کی تشریح کے لئے لازمی سمجھا جاسکے یہی وجہ ہے کہ سائنس انہیں غیر ضروری مفروضات قرار دیتی ہے اور کہتی ہے کہ حیات وکائنات کی تشریح ان مفروضات کے بغیر بھی بہتر انداز میں کی جاسکتی ہے یہی نہیں بلکہ سائنس کا رویہ ان حقائق کے بارے میں تشکیک وارتیاب سے

گزر کر انکار تک جا پہنچتا ہے۔

سائنس اور مذہب کی ہم آہنگی کیسے ممکن ہوسکتی ہے:

سائنس اور مذہب کی ہم آہنگی اور سائنس کو قرآن اور مذہب کے جانچنے کا پیمانہ کیسے بنایا جاسکتا ہے جبکہ ان دونوں کی مابعد الطبیعات مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ سائنس مذہب کے بنیادی حقائق اور اصولوں کا انکار کرتی ہے اور اس کو غیر ضروری مفروضات قرار دیتی ہے لہذا مذہب کو سائنس کے ہم آہنگ بنانا محض بے وقوفی اور کم علمی کے سوا کچھ نہیں جو آج کل ہمارے جدید مفکرین بڑے شد و مد سے کر رہے ہیں اور اس میں یہ عار محسوس نہیں کرتے کہ ایک چیز خدا، رسول، وحی، آخرت جیسے بنیادی حقائق کا انکار کرتی ہے کیسے وہ اس مذہب کا پیمانہ ہوسکتی ہے جس میں یہ چیزیں بنیادی حقائق ہوں اور مذہب اور سائنس کی ہم آہنگی کیسے قرار دی جاسکتی ہے بلکہ آج کل ہمارے بعض جدید مفکرین مثلاً ذاکر نائیک صاحب یہاں تک کہنے میں عار محسوس نہیں کرتا کہ مذہب سائنس کے بغیر لنگڑا ہے اور سائنس مذہب کے بغیر لنگڑی ہے۔

ڈبلیو، ٹی، اسٹیس (W.T. Stace) کا قول:

''مذہب اور سائنس دونوں ایک دوسرے سے متصادم ہیں'' اگر ایک راسخ العقیدہ مسلمان یہ بات کرتا تو کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ یہ آپ نے سائنس کی مذہب دشمنی کے سبب الزام لگایا ہے لیکن اگر یہی بات ایک ایسے آدمی کے طرف سے کہی جائے جو کسی بھی مذہب کو نہ مانتا ہو برطانوی فلسفی ڈبلیو، ٹی اسٹیس (W.T. Stace) ایک ایسا ہی آدمی ہے جو ایک مضمون میں سائنس کے مذہب سے تصادم کو بیان کرتا ہے اور بڑی وضاحت سے اس مضمون میں اس نے کہا ہے۔

''کہ مذہب سے سائنس کا تصادم جزوی نہیں کلی ہے''

ایک برطانوی فلسفی جو کسی بھی مذہب کو نہیں مانتا وہ اس بات کا قائل ہے کہ مذہب اور سائنس میں جزوی تصادم نہیں بلکہ کلی ہے جبکہ ہمارے جدید مفکرین اور خاص کر ذاکر

نائیک صاحب اس بات میں دن رات لگے ہوئے ہیں کہ مذہب اور سائنس دونوں ایک چیز ہے اور سائنس کے بغیر مذہب کچھ نہیں۔

''مذہب سائنس کے بغیر لنگڑا ہے''

اس قسم کے خیالات متجددین کی سائنس اور فلسفے سے ادھوری واقفیت یا کم از کم بے پناہ مرعوبیت کو واضح کرتی ہے یہ حضرات مغرب میں کلیسا اور جدید سائنس کی کشمکش کی تاریخ اور اس کے حقیقی تناظر سے ناواقف ہیں کہ وہاں سائنس نے کلیسا کے بنیادی عقائد کے ساتھ کیا کیا، آیئے کلیسا اور سائنس کی کشمکش کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

کلیسا اور جدید سائنس کی کشمکش ایک تاریخی جائزہ:

آج سے تقریباً دو ہزار دس سال قبل حضرت عیسی علیہ السلام یروشلم کے قریب ایک مقام بیت اللحم میں کنواری مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوئے تیس (۳۰) سال کی عمر میں آپ نے وعظ وتبلیغ شروع کی اور جگہ جگہ وعظ فرما کر معجزوں کا مظاہرہ کیا۔

یہ ایک قانون قدرت تھا کہ جب بھی کوئی نبی اعلان نبوت کے بعد دعوت کا کام شروع کرتا تھا تو سب سے پہلے اس کی تائید کرنے والے اکثر معمولی حیثیت کے لوگ ہوا کرتے تھے جبکہ ان کے مخالفین اثر ورسوخ والے ہوتے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی ایسا ہوا آپ کے وعظ وتبلیغ سے ابتدا میں جو لوگ متاثر ہوئے تھے وہ معمولی حیثیت کے لوگ تھے مثلاً ماہی گیر (Fisher) ترکھان اور دوسرے معمولی پیشوں کے لوگ جب کہ مخالفین میں یہودیوں کا بااثر اور ذی علم طبقہ تھا ان لوگوں نے یہ سوچ کر کہ لوگ آپ علیہ السلام کی تعلیمات سے متاثر نہ ہو جائیں رومی گورنر کو اُکسا کر جرم بغاوت میں گرفتار کرادیا اور صلیب کی سزا طے ہوئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر چڑھانے کے بعد عیسائیت نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور چوتھی صدی عیسوی کی ابتداء میں روم عیسائیت کا مرکز بن گیا، اس کے بعد چرچ کا حلقہ اثر روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ مسیحیت روما کا سرکاری مذہب بن گئی اور

چرچ نے وہ دور بھی دیکھا جس میں پوپ کی قوت بادشاہوں سے بھی زیادہ ہوگئی تھی پوپ کی مرضی خدا کی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا وہ شارع قانون نہ تھا اور ایک آزاد اور خود مختار واضع قانون ہوتا تھا۔

کلیسا کی ترقی اس وقت تک تھی، جب اہل کلیسا اپنی مذہبی روایات اور حضرت عیسی رحمۃ اللہ علیہ کے دین پر مضبوطی سے کھڑے تھے اہل کلیسا جب تک حضرت عیسی علیہ السلام کی سادہ اور بے تکلف زندگی اور اس کی تعلیمات پر قائم رہے اور جب تک عیسائیت کی دلائل نقلی بنیادوں پر رہے تو ان کی گرفت مضبوط رہی لیکن جب صرف عقلی و منطقی اور فلسفیانہ سائنسی دلیلیں عیسائیت کی الہیات، مابعد الطبیعات اور ایمانیات کا حصہ بنیں تو عیسائیت کم زور ہوتی چلی گئی۔

اہل کلیسا کا سائنسدانوں کے ساتھ تصادم:

کلیسا، سائنس، منطق اور فلسفے کے سائے میں مذہبی تعلیمات اور عیسوی اعتقادات کی عقلی اور سائنسی توجیہات پیش کر رہا تھا یہ سلسلہ نہایت کامیابی کے ساتھ اٹھارہ سو سال تک چلتا رہا اور مختلف موقعوں پر کلیسا نے سائنسی ایجادات کو مذہب میں اعتقادات کا حصہ بنا لیا لیکن جب نشہ علم سے سرشار سائنس دان اور جدید علم کے متوالے آگے بڑھتے چلے گئے تو اچانک ایک حادثے سے دوچار ہوگئے، یہ سانحہ کلیسا اور سائنس دانوں کے تصادم کی صورت میں رونما ہوا ان سائنسدانوں کا سابق پالوسی مسیحیت Pluline (Christianity) کے پادریوں کے ساتھ واسطہ پڑا جو انتہائی تنگ نظر ہونے کے علاوہ اقتدار کے حریص تھے، اہل کلیسا نے قدیم سائنس اور فلسفے کو اپنا ایمان اور اعتقاد سمجھ لیا تھا لہذا وہ ادنیٰ درجے کے اختلاف رائے کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے ادھر سائنسدانوں اور فلسفیوں کی اکثر تحقیقات اہل کلیسا میں مروج افکار و نظریات سے ٹکراتی تھیں یہ اختلاف اہل کلیسا کے نزدیک ارتداد کے مترادف تھا اس لئے کلیسا کا تہذیبی شکنجہ ان سائنس دانوں کے خلاف حرکت میں آ گیا، کتنے ہی سائنس دانوں کو ظلم کی

قربان گاہ پر چڑھا دیا گیا، کتنے ہی سائنس دانوں کو اپنے خیالات سے رجوع کرنا پڑا، کلیسا کو سائنسی نظریات کو ایمانیات ماننے پر کیا کیا مجبوریاں پیش آئیں؟ آئیے اب اس کا جائزہ لیتے ہیں:

زمین مرکز کائنات، سائنس اور عیسوی مذہب کا اجماع تھا:

۲۸۰ قبل مسیح سے لے کر پندرھویں صدی تک، فلسفہ سائنس اور عیسوی مذہب کا اجماع تھا کہ زمین مرکز کائنات اور ساکن ہے اور باقی سارا نظام اس کے گرد چکر لگاتا ہے۔ ان کے پاس اس کی دلیل یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اس زمین پر ہوا ہے اور اس کا نزول اس کرہ ارض پر اس بات کی بین دلیل ہے کہ یہ مرکز کائنات ہے۔

اس کا مختصر جائزہ Essential philosophy کے مصنف Jame Mannion کے الفاظ میں پڑھیے:

> Mankind assumed that he, second to God, was the center of the universe. Earth was the center of it all, and the sun and all celestial bodies revolved around it. The Aristotelian view held that the heavens were immutable, or absolute, and the moon, other planets, and stars were smooth, pristine orbs. This view was the one adopted by the Catholic Church.
>
> [The scientific Revolution in Essential philosophy page:65]

کوپرنیکس انقلاب: Coprenicus Revolution

کوپرنکس ۱۹ رفروری ۱۴۷۳ء کو پولستان کے ایک قصبے ٹورن میں پیدا ہوا تھا، اس کے ماں باپ شہر کے صاحب ثروت خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے ٹورن ایک کامیاب

تجارتی مرکز تھا، کوپرنیکس نے اپنی ابتدائی تعلیم اسی شہر میں حاصل کی اٹھارہ سال کی عمر میں نکولاس کو پرنیکس کراکر یونیورسٹی میں داخل ہوا، اور ۱۵۰۳ء میں فیرارایونیورسٹی سے ''دکتور قانون'' کی سند حاصل کی۔

کوپرنیکس نے یونانیوں اور عربوں سے حاصل ہونے والی فلکی پیمائشوں کو درست سمجھا تاہم اس نے سوچا کہ ممکن ہے کہ نئی پیمائشیں کارآمد ہوں اس لئے اس نے مطالعہ اور مشاہدہ جاری رکھا جن کی بنا پر آگے چل کر کائنات کی میکانیت سے متعلق ایک نئی توجیہ سامنے آئی اور پھر کوپرنیکس نے کائنات کا ایسا تصور پیش کیا جس میں سورج کو مرکز کی حیثیت دی اور زمین ایک سیارے کے طور پر اس کے گرد چکر لگاتی ہے اس کے اس انکشاف نے عیسوی مذہب کے اجماع اور دو ہزار سال تک کی اس مسلمہ حقیقت کو غلط اور بے اعتبار ٹھہریا کہ زمین ساکن ہے اور مرکز کائنات ہے کوپرنیکس کے اس انکشاف کو کوپرنیکس انقلاب (Copernicus Revolution) کہا جاتا ہے۔

The Heliocentric Theory

This long-held belief was eventually challenged by Nicolas Copernicus (1473-1543)and mathematically confirmed by johannes Kepler (1571-1630). Their theory was called heliocentric, meaning that the sun was the center of our solar system. and Earth and the other planets revolved around it. This theory was regarded as poppycock and ultimately turned in to heresy. Great Controversy surrounded the hypothesis while it was still only mere speculation. When Galileo invented a telescope and

was able to prove the theory via empirical and indisputable observation, things really hit the fan.

[james mannion, The Scientific Revolution in Essential philosophy page no. 70,71 David & Charles USA, 2006]

کوپرنیکس کے اس انکشاف نے ایک بھونچال برپا کر دیا اور جب اس سے سوال کیا گیا کہ آپ کے پاس اس کی کونسی دلیل ہے تو اس نے ریاضیاتی بنیادوں پر جواب دینے کی کوشش کی لیکن چونکہ اس زمانے کی سائنس سے جو کہ کلیسا کا مذہب بن چکا تھا یہ نظریہ متصادم تھا کوپرنیکس کو توبہ کے لئے کہا گیا لیکن اس نے انکار کر دیا اور اس نظریئے کی پاداش میں اس کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔

کوپرنیکس کے نظریہ کو سب سے زیادہ مدد دینے والا گیلی لیو:

کیپلر، نیوٹن اور گیلی لیو نے کوپرنیکس نظریئے کو سپورٹ کیا لیکن اس نظریہ کو سب سے زیادہ سپورٹ کرنے والا سائنسدان گیلی لیو ہے گیلی لیو ۱۵۶۴ھ میں اطالیہ کے مقام پیزا میں پیدا ہوا جہاں اس نے فلسفہ طبعیات اور ریاضی کا مطالعہ کیا اور شاعری میں بھی بڑے ذوق وشوق سے منہمک رہا، وہ افلاطون اور ارشمیدس کو ارسطو پر ترجیح دیتا تھا تعلیم سے فراغت کے بعد پہلے پیزا (Pisa) اور بعد میں پاڈوا میں پروفیسری کی حیثیت سے وہ قدیم نظام کائنات کی تعلیم دیتا رہا اگرچہ وہ اپنے دل میں ایک عرصے سے نئے نظام کی صداقت کا قائل ہو چکا تھا، اگست ۱۵۹۷ھ میں آپ نے کیپلر کے نام ایک خط لکھا جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"یہ بدقسمتی ہے کہ حق کے متلاشی اور غلط طریقوں کی پیروی نہ کرنے والے لوگ اس قدر کمیاب ہیں کہ حق کے لئے کوئی آواز نہیں اُٹھا سکتا کئی سال ہوئے کہ میں کوپرنیکس کی رائے کا قائل ہو گیا اور اس طریقے سے

میں کئی فطری مظاہر کے اسباب دریافت کر سکا، جو مروجہ مفروضہ سے یقیناً ناقابل توجیہہ ہیں میں نے بہت سے اصول اور بہت سی تردیدیں لکھ رکھی ہیں جن کی میں نے اشاعت نہیں کی اس ڈر سے کہ کہیں میرا بھی وہ حشر نہ ہو جو میرے استاد کوپرنیکس کا ہوا۔

پاڈوا میں قیام کے دوران گلیلیو کو فلکیات سے دلچسپی پیدا ہوگئی اس نے دور بین کی ایجاد کے متعلق سنا اور ایک دوربین بنانے میں لگ گیا جس کے لئے اس نے خود عدسے تیار کئے گلیلیو نے اپنی دوربین کا رخ آسمان کی طرف پھیر دیا اور بہت سے چونکا دینے والے انکشافات کئے اور اس کے بعد گلیلیو نے کھلے طور پر کوپرنیکی نظام کے قائل ہونے کا اعلان کیا۔

The person who contributed most significantly to the defence of the Copernican system was Galileo. He did so in two ways. Firstly, he used a telescope to observe the heavens, and in so doing he transformed the observational data that the Copernican theory was required to explain. Secondly, he devised the beginnings of a new mechanics that was to replace Aristotelian mechanics and with reference to which the mechanical arguments against Copernicus were defused.

[what is this thing called science page no 61]

گلیلیو کا دور بین ایجاد کرنے اور زمین کا گول ہونے کے اعلان کرنے کے بعد ایذارسانی کی زندگی شروع ہوگئی اگرچہ اس نے یکے بعد دیگرے کئی انکشافات کئے جو

اس مفروضے کی تصدیق کرتے تھے مثلاً سورج کے داغ اور زہرہ کی مختلف رویتوں کو دریافت کیا، مگر راہب اور فقیہہ روز افزوں شدت سے اس کی مخالفت کرتے رہے اور ارسطاطالیسی فلاسفہ جو کہ راہب اور پادری ہوا کرتے تھے اس ڈر سے گلیلیو کی دوربین میں جھانکتے بھی نہیں تھے کہ کہیں تغیرات افلاک کا تکلیف دہ نظارہ ان کی آنکھوں کے سامنے آجائے اور قدیم نظام کائنات میں ان کا اعتقاد متزلزل ہوجائے، گلیلیو کا یہ کہنا صحیح تھا کہ اگر خود ستارے آسمان سے اتر کر شہادت دیں تو اس کے مخالفین کو یقین نہیں آئیگا۔ زمین کا مرکز کائنات ہونا اور ساتھ ساتھ ساکن ہونا اہل کلیسا کا بنیادی عقیدہ تھا لہذا گلیلیو کا یہ اعلان وہ برداشت نہیں کرسکتے تھے آخر کار گلیلیو کو گرفتار کیا گیا اور خوفناک سزاؤں کی دھمکی دی گئی وہ ڈر گیا اور علم کی امانت کے مقابلے میں ناپائیدار زندگی اس کی نگاہ میں زیادہ پیاری ثابت ہوئی اور ۲۲ رجون ۱۶۳۳ء کو روما بلا کر گھٹنے ٹیک کر معافی مانگنی پڑی اور جھوٹی قسم کھا کر قولاً وتحریراً اس اجماعی عقیدے کے بارے میں کہ زمین ساکن اور مرکز کائنات ہے کچھ کہنے سے دستبردار ہوگیا اور گوشہ عافیت سے بیٹھ گیا تاریخ عالم میں شاید گلیلیو وہ مشہور سائنسدان ہے جس کو سزائے موت کی دھمکی دے کر سر عام ان سائنسی حقیقتوں کو جھٹلانے اور توبہ کرنے پر مجبور کردیا گیا جو اس نے دریافت کی تھیں۔

لیکن علم کا معصوم تقاضا ایسا نہ تھا کہ ضمیر کو چین لینے دیتا آخر نہ رہا گیا اور سولہ برس کی خاموشی کے بعد اپنی کتاب ''مظالم عالم'' شائع ہی کردی اور اپنے نظریہ کائنات کو دوبارہ دہرایا اس کافرانہ گستاخی پر مغرور کلیسا نے گلیلیو کو دوبارہ قید خانے میں بند کردیا جو جہنم سے کم دردناک نہ تھا بار بار مطالبہ کیا جاتا تھا۔ کہ گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کہ کفر والحاد کا اقرار کرے اور انتہائی خشوع وخصوع کے ساتھ توبہ کا اعلان کرے مگر اس دفعہ علم کی تشنگی ایسی نہ تھا کہ سزا کی ترشی اسے اتار دیتی گلیلیو اپنے مسلک پر استوار رہا اور قید خانے کے بھیانک عذاب سسک سسک کر جھلیتا ہوا ملک بقاء کو سدھارا کلیسا نے اس کی لاش بھی مسیحی قبرستان میں دفن نہ ہونے دی۔

گلیلیو کی موت اور کلیسائی سرکاری معذرت:

کلیسا کی یونانی مذہبی عیسوی سائنس اور جدید سائنس کے مابین تصادم میں گلیلیو جیسا مشہور ریاضی دان سائنسدان، ماہر فلکیات قتل کیا گیا۔ ۹ مئی ۱۹۸۳ء کو ویٹی کن میں پہلی مرتبہ اس المناک قتل پر کلیسا کی جانب سے سرکاری معذرت نامہ جاری کیا گیا جس کے الفاظ یہ تھے۔

The Church experience during the Galileo offair and mature attitude it is only through humble and assiduous study. that the (Church) learns to dissociate The essential of the fath from the Scientific syesten of a given age.

دو ہزار سال تک سائنس، فلسفے، منطق سے عیسوی مذہب کی تطبیق کلیسا کے وجود کے لئے خطرہ بن گئی کیونکہ قدیم سائنس جو کلیسا کا مذہب بن گیا تھا وہ زمانے کی نت نئی ضروریات اور انسان کی بڑھتی ہوئی سائنٹفک معلومات کا مقابلہ کب کرسکتا تھا۔ لہٰذا جدید سائنس اور فلسفہ اس کے لئے ایک عظیم خطرہ بن کر سامنے آیا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ کلیسا کے وقار کو سلامت رکھنے کے لئے یا تو سائنس کی مخالفت کرے یا اپنے مذہب کی مخالفت کرے۔ چوں کہ عوام پر اس کا اقتدار قائم تھا، اس لئے گلیلیو جیسے سائنسدان کو بے شمار کاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا اور بعد میں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا، لیکن جب کلیسا کا اقتدار ڈھیلا پڑا اور نت نئے نظریات اور ایجادات نے ان کا دائرہ تنگ کردیا تو اہل کلیسا کے پاس سوائے اس معذرت کے کچھ نہ رہا جس میں پوپ نے یہ اعلان کردیا تھا ہر زمانے کی سائنس الگ الگ ہوتی ہے۔

The Church learns to dissociate the essential of The fath from the sciontific system of a given age.

اس کے بعد کلیسا مغرب میں ایک غیر اہم ادارہ بن گیا لوگ کلیسا اور مذہب سے متنفر ہونے لگے اور الحاد اور گمراہی کا ایک نیا دور شروع ہوا، لیکن سوال یہ ہے کہ کلیسا کو یہ سب کچھ کیوں کرنا پڑا، یہ قتل یہ مظالم اور پھر آخر میں عاجزانہ معذرت کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے سائنس اور فلسفے کو اپنا مذہب بنایا تھا اور مذہب کے ہر عقیدے کو سائنس کے ساتھ تطبیق دیا کرتے تھے جو بعد میں جدید سائنس کے فروغ کے بعد کلیسا کے وجود کے لئے وبال بن گئی اگر اہل کلیسا سائنس کو محض ایک تجرباتی، حسی مشاہدہ کی حیثیت سے لیتے تو پھر کوئی بات نہ تھی، کلیسا کو یہ سب کچھ نہ کرنا پڑتا لیکن انہوں نے بے جا مذہب کے ہر معاملے میں سائنس اور فلسفے کو ٹھونسا دیا جس کا نتیجہ بہت بڑا بھیانک نکلا۔

نائیک صاحب جو یہ کہتے ہیں کہ مذہب سائنس کے بغیر لنگڑا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب بذات خود کوئی چیز نہیں بلکہ اس کا انحصار سائنس پر ہے اگر سائنس ٹھیک ہے تو مذہب بھی ٹھیک اگر سائنس غلط تو مذہب غلط اس طرح کی غلط تطبیق کرنا ایک غیر علمی، غیر اخلاقی رویہ ہے اور آئندہ کل مسلمانوں کو بھی پھر اسلام کے بارے میں کلیسا کی طرح معذرت کرنا پڑے گی۔

سائنس خدا کا انکار کرتی ہے تو پھر سائنس کا مذہب سے کیا تعلق:

کانٹ کے فلسفے کے بعد جدید سائنس کے ذریعے حقیقت کی تلاش کا سفر ختم ہو گیا، کانٹ نے بتا دیا کہ حقیقت مطلق تلاش نہیں کی جا سکتی انسان اپنے ذہن کے مطابق اس کائنات کو اپنی ذہنی ساخت سے ہم آہنگ کر سکتا ہے لہذا کانٹ کے بعد سائنس تلاش حقیقت کے بجائے تخلیق حقیقت کا طریقہ بن گئی یعنی حقیقت فی نفسہ کچھ نہیں ہوتی، نفس انسانی ہی اصل ہے وہی رب ہے اور سائنس اس کی پرستش کرنے لگی، جب انسان خود خدا بن گیا تو انہوں انسان کے علاوہ ہر ماوراء چیز کو اتھارٹی ماننے سے انکار کر دیا اگرچہ ابتدائی سائنسدان خدا کو ماننے والے لوگ تھے مگر دوسرے لوگوں نے جب تحقیقات (Reserachs) کیں، تو اس نے نے سمجھا کہ اس دریافت نے سرے سے خدا کے

وجود ہی کو بے معنیٰ ثابت کردیا کیونکہ واقعات کی توجیہہ کے لئے جب خود مادی دنیا کے اندر اسباب وقوانین مل رہے ہیں تو پھر اس کے لئے مادی دنیا سے باہر ایک خدا کو فرض کرنے کی کیا ضرورت انہوں نے کہا کہ جب تک دوربین نہیں بنی تھی اور ریاضیات نے ترقی نہیں کی تھی، اس وقت انسان نہیں جان سکتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا ہے اور کیسے ڈوبتا ہے؟ چنانچہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس نے یہ فرض کرلیا کہ کوئی خدائی طاقت ہے جو ایسا کرتی ہے مگر اب فلکیات کے مطالعہ سے ثابت ہوگیا ہے کہ جذب وکشش کا ایک عالمی نظام ہے جس کے تحت سورج چاند اور تمام ستارے اور سیارے حرکت کررہے ہیں اس لئے اب خدا کے ماننے کی کوئی ضرورت نہیں اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کے متعلق پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی ان دیکھی طاقت کام کررہی ہے وہ سب جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردّعمل کا نتیجہ نظر آیا گویا واقعہ کے فطری اسباب معلوم ہونے کے بعد وہ ضرورت آپ سے آپ ختم ہوگئی جس کے لئے پچھلے لوگوں نے ایک خدا یا مافوق الفطری طاقت کا وجود فرض کرلیا تھا اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کے انعطاف (Refraction) سے پیدا ہوتی ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ آسمان کے اوپر خدا کا نشان ہے ہکسلے اس قسم کے واقعات پیش کرتا ہے کس قدر یقین کے ساتھ کہتا ہے:

if events are due to nutural Causes, they are not due to supernatural Causes.

یعنی واقعات اگر فطری اسباب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے پیدا کئے ہوئے نہیں ہوسکتے اور ظاہر ہے کہ جب واقعات کے پیچھے مافوق الفطری اسباب موجود نہ ہو تو کسی مافوق الفطرت ہستی کے وجود پر کیسے یقین کیا جاسکتا ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ مرغی کا بچہ انڈے کے مضبوط خول کے اندر پرورش پاتا ہے اور اس کے ٹوٹنے سے باہر آجاتا ہے یہ واقعہ کیونکر ہوتا ہے کہ خول ٹوٹے اور بچہ جو گوشت کے لوتھڑے سے زیادہ نہیں ہوتا وہ باہر نکل آئے پہلے کا انسان اس کا جواب یہ دیتا تھا کہ

''خدا ایسا کرتا ہے'' مگر اب خورد بینی مشاہدہ کے بعد معلوم ہوا کہ جب ۲۱ روز کی مدت پوری ہونے والی ہوتی ہے اس وقت انڈے کے اندر ننھے بچے کی چونچ پر ایک چھوٹی سی سخت سینگ ظاہر ہوتی ہے اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر آ جاتا ہے سینگ اپنا کام پورا کر کے بچے کی پیدائش کے چند دن بعد خود بخود جھڑ جاتی ہے۔

وہ سائنس جو خدا کا انکار کرتی ہے آخرت اور وحی کا انکار کرتی ہے اس کی اسلام کاری کیسے ممکن ہو سکتی ہے جس نے کثرت پیداوار کے بل بوتے پر لوگوں کو بوالہواس بنا دیا، آخروی نجات کی بجائے دنیاوی عیش و عشرت و آرام کی رجحانات کو عام کیا ان کا روحانی سکون چھین لیا جس نے خدا کی جگہ ایک نئے دیوتا کا روپ دھار لیا اور جس نے انسان کو قائم بالذات ہونے کے زعم میں مبتلا کر دیا ہے سائنس نے پچھلی چند صدیوں میں جو منازل ارتقاء طے کئے ہیں، اس کا سبب وہ سائنسی طریقہ کار ہے جو اپنے ماسواء باقی تمام طریقہ ہائے کار کی نفی کرتا ہے، جو مادیات سے ماوراء ہو جو مشاھدے اور تجربے کے تحت نہ آئے جو وجدان اور محسوسات میں نہ آئے یعنی وحی، آخرت، خدا ان سب چیزوں سے انکار ہے تو پھر اس سائنس کا مذہب کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ W.T Stace کے مطابق مذہب اور سائنس کے درمیان تضاد کلی ہے، لیکن نائیک صاحب مذہب اور سائنس کا تعلق ثابت کرتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں کہ مذہب سائنس کے بغیر لنگڑا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کونسی سائنس؟ وہ سائنس جو خدا، وحی اور آخرت جو کہ مذہب کی بنیادی عقائد ہیں سے انکار کرتی ہے ماوراء محسوسات چیزوں کا جو انکار کرتی ہے، حقیقتوں کا جو انکار کرتی ہے تو ایسی سائنس کا مذہب سے کیا تعلق؟

سائنس اور اسلام میں تطبیق کا راستہ پر خطر راستہ ہے:

ہمارے متجددین حضرات عموماً اور نائیک صاحب خصوصاً مذہب اور سائنس کی تطبیق کی جو نا کام کوشش کر رہے ہیں نہایت پر خطر راستہ ہے کیونکہ یہ دو اقالیم کا معاملہ ہے دونوں کا مابعد الطبعیات (Metaphsice) علمیات (Epistemology) وجودیات

(Ontology) کونیات (Cosmology) مختلف ہیں، دونوں کے منہاج مختلف ہیں، ماخذات علم الگ ہیں، سائنس عقل، تجربے اور مشاہدے کو ماخذات علم تسلیم کرتی ہے جبکہ اسلام علوم نقلیہ کے ساتھ ساتھ ماوارئے محسوسات کو بھی ماخذات علم تسلیم کرتا ہے تو پھر ان دونوں میں تطبیق کیسے ممکن ہے؟ ان دونوں کے درمیان تطبیق کرنا ایک پر خطر راستہ ہے جس سے ہر حال میں بچنا چاہئے۔

سائنس اور مذہب کی تعلیمات میں فرق:

مذہب کی تعلیمات وحی پر مبنی ہوتی ہیں جبکہ سائنس صرف عقل اور حواس ظاہرہ پر، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی جو عقل و دانش ہوتی ہے، اس کی بہ نسبت سائنس دانوں کے علم و عقل پر حقیقی معنیٰ میں علم و عقل کے الفاظ کا اطلاق صحیح نہیں ہوگا۔

مذہب کی بنیاد انبیاء کرام پر موقوف ہوتی ہے اور انبیاء کرام کا علم قطعی اور ان کے تمام نظریات و تحقیقات محکم اور یقینی ہیں اور فلاسفہ اور اہل سائنس کا علم مشکوک اور ان کی بہت سی تحقیقات ظنی اور تخمینی ہیں کیونکہ حضرات انبیاء کا تعلق علم کے حقیقی سر چشم ربّ کائنات سے ہے، جس کا علم ساری کائنات کو محیط اور جس کے علم میں بھول چوک کا کوئی امکان ہی نہیں قرآن کریم میں ہے کہ "لایضل ربی ولا ینسیٰ" دوسری جگہ میں ہے کہ "الا یَعْلَمُ من خلق وھو اللطیف الخبیر"۔

بخلاف سائنس دانوں کے کہ ان کے علم کا تعلق یا تو ان کے افکار سے ہے یا تجربوں سے، یا مشاہدات سے جن میں سے کسی ایک کو بھول چوک اور غلطی سے ماوراء نہیں قرار دیا جا سکتا ہے، حضرات انبیاء کرام اور سائنس دانوں کے مابین ایک اور فرق بھی ہے کہ ہر آنے والا سائنس دان اپنے پیش رو کی تغلیط و مخالفت کو اپنی زندگی کا ایک اہم کارنامہ سمجھتا ہے، جیسا کہ اس کی قدرے تفصیل گزر چکی ہے نیز فلسفہ کے مشہور عالم لطفی جمعہ کے بقول امر سطاطالیس نے اپنے قبل الہین کی پوری پوری تردید کی یہاں تک کہ ان سب سے برأت حاصل کر لی۔ [تاریخ فلاسفۃ الاسلام ص:۹۱]

اور حضرات انبیاء کرام کی شان یہ ہے کہ ہر آنے والا پیغمبر اپنے سابق پیغمبر کی کھلے دل سے تصدیق وتائید کرتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بات نقل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

واذقال عیسیٰ ابن مریم یٰبنی اسرائیل انی رسول الله الیکم مصدقاً الما بین یدّی من التورۃ ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمه احمد. [الصف: ٦٠]

ترجمہ:" اور جبکہ عیسیٰ ابن مریم نے فرمایا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے توراۃ ہے، میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں جن کا نام احمد ہوگا ان کی بشارت دینے والا ہوں۔"

یہی فرق انبیاء کرام کے دیئے ہوئے علم اور ان کے دیئے ہوئے نظریات وافکار کی غیر مشکوک صحت اور قطعیت پر اور سائنس دانوں کے نظریات وافکار اور تحقیقات کے ظنی، مشکوک اور تخمینی ہونے پر ایک بین دلیل ہے ورنہ ایک سائنس دان دوسرے کی کس طرح تردید ومخالفت کرسکتا ہے؟ اور ظاہر ہے کہ جب تغلیط وتردید کررہا ہے تو ضرور ایک نہ ایک غلطی پر ہوگا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرات انبیاء کا نشان امتیاز آپس میں اتحاد، یگانگت وتوافق ہے اور سائنس دانوں کی علامت امتیاز آپس ہی میں سب وشتم، تکذیب وتغلیط اور اختلاف ہے۔

خلاصہ بحث:

ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جدید مفکرین اور خاص کر ذاکر نائیک صاحب کا سائنس اور مذہب وقرآن کا تعلق اس طور پر ثابت کرنا کہ ان کا سمجھنا ایک دوسرے پر موقوف ہیں احمقانہ فعل ہے کیونکہ سائنس انسان کا کامل تعلق کائنات سے اس طور پر ظاہر

نہیں کرسکتی جیسا کہ مذہب کرتا ہے کیونکہ سائنس کا دائرہ محدود ہے اس کی رسائی صرف مادی اشیاء تک ہے لیکن مذہب کی حکومت بہت وسیع ہے، وہ مادی اور غیر مادی دونوں مملکتوں پر حاوی ہے اور اس کے اصول دور دور تک پہنچتے ہیں جہاں سائنس کے پر جلتے ہیں وہاں مذہب نہ صرف ان فرائض کو ادا کرتا ہے جو انسان کے نفس سے متعلق ہیں یا جو دوسروں سے متعلق ہیں بلکہ وہ ان فرائض کا بھی خیال رکھتا ہے جو ان لوگوں کے متعلق ہیں جو ابھی تک وجود میں نہیں آئے نہ صرف یہی بلکہ وہ تو اس عالم سے بھی متعلق ہے جہاں ہمیں اس دنیا سے کوچ کرنے کے بعد جانا ہے سائنس انسان کی روح اور روحانی عالم اور عقبیٰ کا انکار کرتا ہے، کیونکہ وہ کوتاہ نظر ہے لیکن اس کے انکار سے کسی شئے کی ہستی زائل نہیں ہوسکتی اہل سائنس اپنے بھورے برابر علم پر اس قدر نازاں اور مغرور ہیں کہ جو بات ان کے علم میں نہیں اس سے وہ جھٹ انکار کر بیٹھتے ہیں اور چند قانون جو ان کو معلوم ہوتے ہیں ان پر اس قدر بھروسہ ہے کہ جو بات ذرا ان کے خلاف نظر آئے فوراً یہ کہہ دیتے ہیں یہ ناممکن ہے یا قانون کے خلاف ہے چند مفروضوں اور قیاسات پر وہ مذہب اور اس کے بنیادی عقائد کا انکار کرتے ہیں لیکن ہمارے مسلمان جدید مفکرین ہر حال میں سائنس کی اسلام کاری کرر ہے ہیں اور اس کا ثبوت قرآن سے پیش کرتے ہیں یہ امت مسلمہ کے لئے ایک بہت بڑا المیہ ہے جس کی روک تھام ضروری ہے اگر نہیں روکا گیا تو پھر ایک خطرناک فکر گمراہی کا راہ اختیار کرسکتی ہے۔

......☆☆☆......

باب ثالث

ڈاکٹر ذاکر نائیک کے افکار کا علمی جائزہ:

اس تیسرے باب میں انشاء اللہ ذاکر نائیک صاحب کے افکار کا علمی جائزہ لیا جائیگا لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ اس کا اجمالی تعارف کیا جائے۔

تعارف:

ذاکر نائیک کا پورا نام ڈاکٹر ذاکر عبدالکریم نائیک ہے۔ ۱۸/اکتوبر ۱۹۶۵ء کو انڈیا کے علاقہ تندل سٹریٹ شمالی دونگری بمبئی میں پیدا ہوئے آج کل یہ شہر ممبئی کہلاتا ہے، ڈاکٹر ذاکر نائیک کا بچپن اور جوانی اسی شہر میں گزرے جو فلم سازی اور دیگر ثقافتی سر گرمیوں کا مرکز ہے عیسائیوں کے سینٹ پیٹرز ہائی سکول سے میٹرک کیا میٹرک کرنے کے بعد ھندؤوں کے کرشن چندر چیلے رام کالج سے ایف ایس سی F.S.C کی۔ بعد ازاں ممبئی کے نائر اہسپتال سے وابستہ ٹوپی والا میڈیکل کالج سے انہوں نے طب کی تعلیم حاصل کی اور یوں انہیں یونیورسٹی آف ممبئی کی جانب سے M.B.B.S کی ڈگری ملی۔

ایم، بی، بی، ایس کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے علوم اسلامی اور مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ شروع کیا اور مطالعہ کرنے کے بعد متعدد تربیتی پروگرام کا انعقاد کرتے رہے جس میں انگریزی میں خطابت تمام جدیدیت پسند اور تعلیم یافتہ (Educated) لوگوں کو متاثر کر دیا ہے۔ آج کل ڈاکٹر صاحب ایک ٹی وی T.V چینل بھی چلا رہے ہیں آپ کے تقاریر کے بعد بالعموم سوال و جواب کا ایک وقفہ ہوتا ہے جس میں وہ اکثر اپنی کم علمی کی وجہ سے حاضرین کے سوالوں کے غلط جوابات دیتے ہیں جو کہ غیر مطمئن اور اکابر علماء کے نظریئے سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب اب تک دنیا کے مختلف ملکوں میں ایک ہزار کے لگ بھگ خطبات پیش کر چکے ہیں، جو کہ اکثر اغلاط کے مجموعے ہیں، خطبات میں بھی بحیثیت

ایک مناظر شرکت کی ہے اور اس کا مشہور مناظرہ ڈاکٹر ولیم کیمبل کے ساتھ ہے جو بعد میں انشاء اللہ اس کتاب میں اس مناظرے کے ساتھ ساتھ اس کے تمام خطبات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے گا۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک اس وقت ممبئی میں قائم تین تنظیموں کے سربراہ ہیں۔

(1) Islamic Research Foundation.

(2) I.R.F Educational Trust.

(3) Islamic Dimensions.

ڈاکٹر ذاکر نائیک کا ولیم کیمبل کے ساتھ مناظرہ

اغلاط کا مجموعہ:

ڈاکٹر ذاکر نائیک کا مشہور مناظرہ جو اس نے ڈاکٹر ولیم کیمبل سے کیا تھا یہ مناظرہ اغلاط کا مجموعہ ہے جو کہ ڈاکٹر صاحب کی کم علمی اور مغرب وسائنس سے مرعوبیت کی بیّن دلیل ہے، اس مناظرے میں ڈاکٹر صاحب نے جابجا قرآن کو سائنس سے ثابت کرنے اور سائنس سے قرآن کی تصدیق کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ ایک غیر علمی غیر اخلاقی رویّہ ہے، سائنس اور قرآن کا موازنہ کرنا بہت بڑا ظلم ہے کیونکہ سائنس علم کے دائرے میں نہیں آتی، جبکہ قرآن علم بھی ہے علم حقیقت بھی اس علم حقیقی کو جو خالق حقیقی نے وحی کے ذریعے عطاء کی ہے سائنس ظنی، قیاسی غیر قطعی علم کے ساتھ کیسے موازنہ کیا جاسکتا ہے اس مناظرے میں جتنی باتیں ہی قابل اعتراض ہیں، اس کتاب میں انشاء اللہ اس کی نشاندہی کی جائے گی جس سے نائیک صاحب کی سطحی علم اور مغرب اور سائنس سے بے پناہ مرعوبیت اشکارہ ہوجائی گی۔ آیئے اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ

قرآن مجید جدید سائنس سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟

''کیا مسلم کیا غیر مسلم اب اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن روئے زمین پر عربی ادب کا بہترین نمونہ ہے، لیکن آج کا دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے، آیئے دیکھتے ہیں کہ

قرآن جدید سائنس سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟

[خطبات ذاکر نائیک، ص:۴۰ کتاب سرائے لاہور]

اس کتاب میں چھ ہزار سے زیادہ نشانیاں یعنی آیات ہیں جن میں تقریباً ایک ہزار ایسی ہے جن کا تعلق سائنس سے ہے۔[ص:۴۱]

قرآن سائنس کی کتاب نہیں:

جس طرح پروردگار کائنات کی ذات اولین وآخرین ہے اسی طرح اس کا کلام یعنی قرآن مجید بھی ازلی اور قدیم ہے، اور قیامت تک آنے والے آخری انسان کے لئے عالمگیر اور آخری کتاب ہدایت ہے، تمام بنی آدم اور نوع انسانی کو برائیوں کی اندھیروں سے نکالنے اور روشنی میں لانے کا واحد ذریعہ اور انسان وانسانیت کو دنیا وآخرت کی بربادی اور ہلاکت سے نجات دلانے کا واحد راستہ قرآن کریم ہے، لوگ جتنے اس کے قریب آئیں گے اسی انداز سے ان کو دنیا میں بھی امن وامان اور عافیت واطمینان نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی فلاح وکامیابی حاصل ہوگی، اور جتنے اس سے دور ہوں گے اتنا ہی دونوں جہاں کی خرابیوں، بربادیوں، مصیبتوں اور پریشانیوں کے غار میں گریں گے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

الٓرٰ قف کتٰبٌ انزلنٰه الیك لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور باذن ربهم. [سورۃ ابراھیم آیت:۱]

''یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے اتاری تیری طرف کہ تو نکالے لوگوں کو اندھیروں سے اجالے کی طرف ان کے رب کے حکم سے۔''

قرآن کی نزول کا مقصد کہ خدا کے حکم وتوفیق سے تمام دنیا کے لوگوں کو خواہ عرب ہو یا عجم، کالے ہو یا گورے، مزدور ہو یا سرمایہ دار، بادشاہ ہو یا رعایا سب کو جہالت کی گھٹاٹوپ اندھیروں سے نکال کر معرفت اور ایمان ویقین کی روشنی میں کھڑا کرنا ہے اور یہ کہ لوگ صحیح معرفت الٰہی کی روشنی میں اس راستہ پر چل پڑیں جو زبردست، غالب، لائق حمد وتعریف، شہنشاہ مطلق، مالک الکل خدا کا بتایا ہوا اور اس کے مقام رضا تک پہنچانے

والا ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

یاایها الناس قد جاء کم برهان من ربکم وانزلنا الیکم نوراً مبیناً

''لوگو! تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیل آ گئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہو۔''

ان آیات کریمہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ قرآن کے نزول کا مقصد ہدایت انسانی ہے یہ کوئی سائنٹفک نظریات کی کتاب نہیں ہے اور نہ اس لئے آیا ہے کہ تجربی طریقہ سے سائنس مرتب کرلے لیکن ذاکر نائیک صاحب کسی نہ کسی طریقے سے قرآن کریم کے اندر ان علوم کو تلاش کرتے ہے اور سائنسی نظریات کو اس طرح قرآن سے ثابت کرتے رہتے ہیں کہ گویا ان نظریات کا اثبات نزول قرآن کے مقاصد میں داخل ہے اور سائنس کے مختلف نظریات میں قرآن ان جدید نظریات کا فریق ہے اور اسی غرض کے حصول کے لئے بسا اوقات نائیک صاحب تفسیر کے مسلم اصولوں کی خلاف ورزی سے بھی دریغ نہیں کرتے ہیں، نائیک صاحب کی کم علمی پر حیرت ہے کہ وہ قرآن کی طرف ایسی بات منسوب کرنا چاہتے ہیں جو اس کے دائرے سے خارج ہے اور اس پر ایسی ذمہ داری ڈالنا چاہتے ہیں جو اس کو مقصود نہیں، نائیک صاحب اس میں طب کیمیا اور فلکیات وغیرہ کی جزئیات نکالنا چاہتے ہیں گویا کہ اس طرح وہ اس کی عظمت و بلندی ثابت کرسکیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن اپنے موضوع پر ایک مکمل کتاب ہے اور اس کا موضوع مذکورہ بالا تمام علوم سے زیادہ اہم ہے لہذا یہ بات درست نہ ہوگی کہ کائنات کے بارے میں جن آخری حقائق کا ذکر قرآن کائنات کے مزاج، اس کے خالق سے اس کے تعلق اور اجزاء کائنات کے درمیان باہمی ربط واضح کرنے کے دوران کبھی کبھی کرتا ہے۔ ان کو ہم انسانی عقل کے قائم کردہ مفروضات (Hypotheses) اور نظریات (Theories) کا پابند بنادیں، یہ طریقہ تو ہمیں ان سائنٹفک حقائق (Scientific facts) کے سلسلے میں بھی نہیں اختیار کرنا چاہئے، جن تک انسان اپنی دانست میں تجربے

کے قطعی طریقے سے پہنچتا ہے قرآن کے حقائق آخری، قطعی، اور مطلق حقائق ہیں انسانی تحقیق جو حقائق دریافت کرتی ہے قطع نظر اس کے کہ اس تحقیق کے ذرائع کیا ہے؟ وہ نہ آخری ہوتے ہیں نہ قطعی یہ حقائق ان حدود کے اندر ہی درست ہوتے ہیں جن کے اندر انسانی تجربہ کیا جاتا ہے اور جن آلات و ذرائع سے ان میں کام لیا گیا ہو وہ بھی ان کی حدیں مقرر کرتے ہیں لہذا انسان کے اپنے سائنٹفک طریقہ تحقیق کی روشنی میں یہ طریقہ غلط ہوگا، کہ ہم قرآن کی آخری حقائق کو ایسے حقائق پر معلق کردیں جو آخری نہیں ہیں۔

نائیک صاحب کا قرآن کے عام اشارات کو سائنس کے نت نئے اور بدلتے رہنے والے نظریات سے جوڑنے کی ہر کوششیں اولاً تو منہاج (Paradigm) کے اعتبار سے نہ غلط ہیں بلکہ ساتھ ساتھ یہ داخلی شکست خوردگی بھی ہے جو اس کو اس گمان میں مبتلا کیا ہوا ہے کہ اصل چیز سائنس ہے اور قرآن کا کام اس کے پیچھے چلنا ہے لہذا وہ سائنس کے ذریعے قرآن کو قوت بخشنا چاہتے ہیں یا سائنس سے قرآن کے حق میں دلیل فراہم کرنا چاہتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اپنے موضوع پر ایک مکمل کتاب ہے اور وہ جو حقائق بیان کرتا ہے وہ آخری حقائق ہیں سائنس کا اپنے موضوع میں یہ حال کہ وہ کل جس بات کو ثابت کرچکی ہے اسے آج رد کردیتی ہے اور اُن حقائق کو وہ دریافت کرتی ہے وہ نہ آخری ہوتے ہیں اور نہ مطلق کیونکہ سائنس کا واسطہ انسان، اس کی عقل اور اس کے ذرائع و آلات ہیں، جن کی ماہیت ہی ایسی ہے کہ وہ ایک بھی آخری اور مطلق حقیقت عطا نہیں کرسکتی۔

نائیک صاحب کی غلطی:

نائیک صاحب جو قرآن کو جدید سائنس کے ہم اہنگ بنانے کی کوشش کررہے ہیں درحقیقت یہ تصور اس کا سائنس کی شان وشوکت سے بیجا مرعوب ذہنیت کا نتیجہ ہے ورنہ اس کا یہ نظریہ اس وجہ سے غلط ہے کہ قرآن کوئی سائنس کی کتاب نہیں کہ اس کو جدید سائنس کا ہم آہنگ بنایا جائے دوسری وجہ یہ ہے کہ سائنس دانوں کے نظریات آئے دن

بدلتے رہتے ہیں ہر ایک آنے والا اپنے پیش رو کی تغلیط کرتا ہے فیثا غورث آتا ہے سائنس کی دنیا میں دھوم مچاتا ہے اور بطلمیوسی آ کر اس نظریہ کو غلط بتاتا ہے پھر یورپین سائنس دان آتے ہیں اور بطلمیوسی نظریہ کی (جس نے سائنس کی دنیا میں کافی عرصہ بڑی کامیابی کے ساتھ حکمرانی کی تھی) تغلیط کر دیتے ہیں اس صورت میں اگر قرآن کریم کو کسی نہ کسی طریقے سے اس جدید سائنس کا فریق بنا دیا جائے اور کل اس کا یہی نظریہ خود سائنس دانوں کے نزدیک غلط ثابت ہو جائے جو سو فیصد ممکن ہے تو کیا اس صورت میں قرآن کی ایسی تفسیر پڑھنے والا ہر شخص یہ نہ سمجھ بیٹھے گا کہ قرآن کریم کی بات (معاذ اللہ) غلط ہوگئی ذرا سوچیئے کہ یہ قرآن کی تفسیر ہے یا تحریف؟

نائیک صاحب کو یہ امر نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ قرآن کو سائنس کے مطابق ڈھالنے کا رجحان انتہائی خطرناک ہے کیونکہ سائنس کے اصول ونظریات میں تجربہ اور تحقیق کی ترقی کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں جبکہ قرآن حکیم وہ آخری کتاب ہے جس میں ترمیم وتغیر کی گنجائش نہیں ہے قرآن کی بنیاد وحی پر ہے جس میں کسی قسم کی غلطی کا امکان نہیں ہے، جبکہ سائنس کا دارمدار انسانی علم وتجربہ پر ہے جسے کسی بھی مرحلہ میں خطاء سے ماوراء نہیں قرار دیا جاسکتا قرآن کریم موضوع بحث سے خارج ہونے کی وجہ سے سائنسی کارناموں سے کوئی بحث کرتا ہے اور نہ ان چیزوں کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے بلکہ یہ چیزیں قرآن وحدیث کی نظر میں بالکل بے قیمت اور لایعنی مشغلے ہیں کیونکہ قرآن وحدیث کا مطمع نظر صرف اور صرف انسانیت کی ہدایت اور رہنمائی، سچائی اور بھلائی کی تلقین، خلق کا خالق سے رشتہ ملانا، فکر آخرت اور روحانیت کی طرف دعوت دینا، انسان کی فلاح و بہبود کا بندوبست کرنا اور انسان کو حقیقی معنیٰ میں انسان بنانا ہے ان سائنسی تحقیقات کا روحانیت، فکر آخرت اور انسان کی دینی ضروریات کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہیں ہے بلکہ اگر غور اور انصاف سے دیکھا جائے تو یہ ساری چیزیں انسانیت کے کھلے دشمن ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی ہو یا کوئی اور

چیز جب تک اس کا دریافت کرنا اور استعمال کرنا خدا کے بتائے ہوئے اصولوں اور احکام کے مطابق نہ ہو تو وہ چیز انسانیت کے لئے یقیناً تباہ کن ثابت ہوگی خلاصہ یہ کہ موجود سائنس کے جدید ترقیات وتحقیقات کو عین منشاء قرآنی سمجھنا غلط ہے جیسا کہ بعض تجدد پسندو کا عموماً اور نائیک صاحب کا خصوصاً مشغلہ ہے۔

کیا سائنسی تحقیقات پر قرآن فہمی موقوف ہے؟

نائیک صاحب علماء یورپ اور ان کی تحقیقات سے مرعوب ہوکر جو دن رات یہ کہ رہا ہے کہ قرآن میں اتنی آیات کا تعلق سائنس سے ہے قرآن کی کوئی آیت بھی جدید سائنس کے ساتھ نہیں ٹکراتی ہے سوال یہ ہے کہ کیا ان سائنسی تحقیقات پر قرآن کا سمجھنا موقوف ہے؟ اور چاند، مریخ اور زہرہ پر کمندیں پھینکنے کی مساعی قرآن کریم کے تقاضے کو پورا کرتا ہے واقعہ کی دنیا میں اگر سوچا جائے تو ان حضرات کا یہ تصور سرتاپا غلط اور ساقط الاعتبار ہے مذکورہ بعض باتوں سے اس کی غلطی ایک حد تک عیاں ہوجاتی ہے تاہم مزید وضاحت کے لئے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

> ''یہاں یہ بات اصولی طور پر سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کوئی فلسفہ، ہیئت اور سائنس کی کتاب نہیں جس کا موضوع بحث حقائق کائنات یا آسمان اور ستاروں کی ہیئت وحرکت وغیرہ کا بیان ہو مگر اس کے ساتھ وہ آسمان وزمین اور ان کے درمیان کے کائنات کی ذکر بار بار کرتا ہے اُن میں غور وفکر کی طرف دعوت بھی دیتا ہے قرآن کریم کے ان تمام آیات میں غور کرنے سے واضح طور پر یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ قرآن عزیز ان حقائق کونیہ کے متعلق انسان کو صرف وہ چیزیں بتلانا چاہتا ہے جن کا تعلق اس کے عقیدے اور نظریئے کی درستی سے ہو یا اس کی دینی اور دنیوی منافع ان سے متعلق ہوں۔
>
> مثلاً قرآن کریم نے آسمان وزمین اور ستاروں، سیاروں کا اور ان کی

حرکات سے پیدا ہونے والے آثار کا ذکر بار بار ایک تو اس مقصد سے کیا ہے کہ انسان ان کی عجیب وغریب صنعت اور فوق العادت آثار کو دیکھ کر یہ یقین کرے کہ یہ چیزیں خود بخود پیدا نہیں ہوگئیں ان کو پیدا کرنے والا کوئی سب سے بڑا حکیم سب سے بڑا علیم سب سے بڑا صاحب قدرت وقوت ہے اور اس یقین کے لئے ہرگز اس کی ضرورت نہیں کہ آسمانوں کی اور فضائے مخلوقات اور ستاروں، سیاروں کے مادے کی حقیقت اور ان کی اصلی ہیئت وصورت اور ان کے پورے نظام کی پوری کیفیت اس کو معلوم ہو بلکہ اس کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے جس کو ہر شخص مشاہدہ سے دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شمس وقمر اور دوسرے ستاروں کے کبھی سامنے آنے اور کبھی غائب ہو جانے سے نیز چاند کے گھٹنے بڑھنے سے اور رات دن کے انقلاب سے پھر مختلف موسموں اور مختلف خطوں میں دن رات گھٹنے، بڑھنے کے عجیب وغریب نظام سے جس میں ہزاروں سال سے کبھی ایک منٹ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آیا ان سب امور سے ایک اونچی عقل وبصیرت رکھنے والا انسان یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ حکیمانہ نظام یوں ہی خود بخود نہیں چل رہا ہے بلکہ کوئی اس کو بنانے والا، چلانے والا اور باقی رکھنے والا ہے اور اتنا سمجھنے کے لئے انسان کو نہ کسی فلسفی تحقیق اور آلات رصدیہ وغیرہ کی حاجت پڑتی ہے، نہ قرآن نے اس کی طرف دعوت دی، قرآن کی دعوت صرف اسی حد تک ان چیزوں میں غور وفکر کی ہے جو عام مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہو سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے الات رصدیہ بنانے یا مہیا کرنے اور اجرام سماویہ کی ہیئتیں دریافت کرنے کا مطلقاً کوئی اہتمام نہیں فرمایا، اگر ان آیات کونیہ میں تدبیر اور غور وفکر کا یہ مطلب ہوتا

کہ ان کے حقائق، ھیئات اوران کی حرکات کا فلسفہ معلوم کیا جائے تو یہ ناممکن تھا کہ رسول اللہ ﷺ اس کا اہتمام نہ فرماتے خصوصاً جبکہ ان فنون کا رواج اور تعلیم و تعلّم کا سلسلہ دنیا میں اس وقت بھی موجود تھا، مصر، شام، ھند، چین وغیرہ میں ان فنون کے جاننے والے اور ان پر کام کرنے والے موجود تھے۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے پانچ سو سال پہلے فیثا غورث کا اور اس کے بعد بطلموسی کا نظریہ دنیا میں شائع اور رائج ہو چکا تھا، اور اس زمانے کے حالات کے مناسب آلات رصدیہ وغیرہ ایجاد بھی ہو چکے تھے مگر جس ذات قدسی پر یہ قرآنی آیات نازل ہوئیں اور جن صحابہ کرام نے بلا واسطہ آپ ﷺ سے ان کو پڑھا انہوں نے کبھی اس طرف التفات تک نہیں فرمائی اس سے قطعی طور پر معلوم ہوا کہ ان آیات کو نیہ تدبر اور غور وفکر کا وہ منشاء ہرگز نہ تھا جو آج کل کے بعض تجدد پسند علماء نے یورپ اوراس کی تحقیقات سے متاثر ہو کر اختیار کیا ہے کہ خلائی سفر، چاند مریخ اور زہرہ پر کمندیں پھینکنے کی مساعی قرآن کریم کے تقاضے کو پورا کرنا ہے۔

[معارف القرآن ۴۸۹/۶، ۴۹۰]

قدیم سائنس بھی اپنے وقت میں جدید تھا:

نائیک صاحب جو جدید سائنس کا قرآن کے ساتھ مطابقت ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے تو کیا قرآن قدیم سائنس کے ساتھ مطابقت رکھتا تھا یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ قدیم سائنس بھی ان ہی تجربات، محسوسات، مشاھدات سے نتائج اخذ کرتی تھی تو پھر قرآن قدیم سائنس سے کیوں مطابقت نہیں رکھتا ہے؟ قدیم سائنس کی نظریات جو کسی وقت میں اس پر اجماع ہوا کرتی تھی کیوں مسترد (Reject) ہوئے؟ اگر آج نائیک صاحب قرآن کی مطابقت جدید سائنس کے ساتھ بھی ثابت کرے، تو یہ جدید

سائنس کل قدیم ہو جائیگی کیوں کہ قدیم سائنس بھی اس وقت جدید ہوا کرتی تھی تو کیا ہوا کہ وہ جدید سائنس قدیم ہوئی اور اس کی جگہ نئی سائنس نے لے لی اور وہ تمام نظریات مسترد ہوئے تو اگر کل جو آج کا جدید سائنس ہے غلط ثابت ہو جائے، تو پھر کیا قرآن میں تحریف کرنا پڑے گا؟ یا اس جدید سائنس کو جس کی موافقت اور ہم آہنگی قرآن کے ساتھ ثابت کی جا رہی ہے غلط کہا جائے گا۔

کیونکہ اگر قرآن سائنس کے کسی نظریئے، اصول، تجربے کی تصدیق کرتا ہے تو اس کا سو فیصد امکان موجود ہے کہ یہ نظریئے مستقبل میں غلط ثابت ہو جائیں گے، لہذا قرآن کو سائنسی منہاج پر پرکھنے کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ قرآن میں سائنسی غلطیوں کا امکان پیدا ہوتا رہے گا۔

لہذا نائیک صاحب کا سائنس کی اصول و نظریات کو ابدی اور سرمدی سمجھ کر ان کی چمک دمک سے مرعوب و متاثر ہونا بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جا رہا ہے سائنس کی اصول و نظریات کی خامیاں و غلطیاں ظاہر ہوتی جا رہی ہے اور وقتاً فوقتاً اس میں تبدیلیاں بھی ہو رہی ہیں، قرآن کلام الٰہی ہے نہ غلطی کا امکان نہ کسی تبدیلی کا امکان سائنس قدیم اور جدید کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی بنیاد محض خیالات پر ہے جن کا نفس الامر سے کوئی تعلق نہیں ہے اسی نتیجے کے بیناد پر سائنس نہ حقیقت (Reaillty) ہے نہ حقیقت علم Reality of Knowledge ہے کیونکہ سائنس اپنے ہونے کا جواز اپنے اندر ہی نہیں رکھتی لہذا اسے علم قرار دینا ممکن ہی نہیں جب کہ قرآن حکیم علم ہے اپنے ہونے کا جواز اپنے اندر رکھتا ہے، علم حقیقت ہے لہذا نائیک صاحب کا اس علم حقیقی کو جو خالق حقیقی نے وحی کے ذریعے عطاء کیا ہے سائنس ظنی، قیاسی، غیر قطعی علم سے موازنہ کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔

میں اسے صرف ایسی حقائق تک محدود رکھوں گا جو ثابت شدہ ہوں ان سائنسی نظریات کے بارے میں بات نہیں کروں گا، جن کی حیثیت محض مفروضوں اور اندازوں

سے زیادہ نہیں جن کا کوئی ثبوت موجود نہیں کیوں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ سائنس بعض اوقات پلٹا بھی کھا جاتی ہے۔ [خطبات ذاکر نائیک ص:۴۱ کتاب سرائے لاہور]

سائنس میں ثابت شدہ حقائق کیا ہوتے ہیں؟

نائیک صاحب نے اپنی تقریر میں یہ کہتا ہے کہ میں اسے صرف ایسی سائنسی حقائق تک محدود رکھوں گا جو ثابت شدہ ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ سائنس میں نائیک صاحب کے نزدیک ثابت شدہ حقائق کیا ہوتے ہیں؟ کیونکہ سائنس کی دنیا کے بڑے بڑے فلاسفر اور سائنس دان اپنے الفاظ میں اس بات کا بار بار اقرار کرتے ہیں کہ سائنسی علم قطعاً ٹھوس نہیں ہے، بلکہ عارضی، مفروضاتی، قیاسی، لمحاتی اور غیر قطعی نوعیت کا ہے، لیکن نائیک صاحب فرماتے ہیں کہ ثابت شدہ حقائق ہے، جس علم کی ابتداء شک پر ہو اور انجام شک اور جس چیز پر شک نہ کیا جائے وہ علم کے زمرے سے خارج اور جس میں علم (Knowledge) پر یقین ہو وہ سائنس اور فلسفے کی دنیا میں ہی علم نہیں کہلاتا، تو ایسا علم مصدقہ اور ثابت شدہ حقیقت کیسے ہوسکتا ہے۔

پاپر (Popper) جیسے عظیم فلسفی اور سائنس دان یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ سائنس کوئی معروضی حقیقت نہیں سائنس ہم اپنی غلطیوں سے سیکھتے ہیں، سائنسی ترقی Trial and Error کے اصول کے ذریعے ہی ممکن ہے کیونکہ مشاہدات بیانات کے ذریعے منطقی طور پر آفاقی قوانین اور نظریئے وضع کرنا امر محال ہے، ہم ہر لمحہ سچ کے بارے میں زیادہ جان سکتے ہیں اور سچ کے قریب پہنچ سکتے ہیں دوسرے معنوں میں سچ کو مطلق طور پر پانے کی جدوجہد ہی کرتے رہتے ہیں حاصل نہیں کر پاتے۔

سائنسی عمل کی نظری حصہ حقیقت کی توجیہ سے قاصر ہے سائنسی نظریات کو حقیقت جاننے کا عمل تصور کرنا محض غلط فہمی ہے اکثر سائنسی نظریات محض افسانوی کہانیاں ہیں ہر دور میں لوگوں کو فریب دیتی ہے اور ہر مرتبہ یہ افسانوی حقیقت بدلتی چلی جاتی ہے یہ کیسی حقیقت ہے جو تصورات ذہنی کی طرح اڑتے ہوئے بادلوں کی طرح بدلتی رہتی

ہیں(Realism) کا بھی سچائی سے کوئی تعلق نہیں دنیا فی الحقیقت کیا ہے؟ یہ کائنات اصل میں کیسی ہے؟ کوئی سائنسی نظریہ اس کی حقیقت بتا ہی نہیں سکتا اور جو حقیقت یا جزوی حقیقت بہ ظاہر معلوم بھی ہوتی ہے اس کے بارے میں ہمیں کیسے معلوم ہو کہ یہ وہی حقیقت ہے جو خالق حقیقت کے تصور حقیقت سے ہم آہنگ ہے ظاہر ہے سائنس کے پاس ایسا کوئی پیمانہ نہیں کیونکہ جب تک حقیقت کا حقیقی پیمانہ آپ کے پاس موجود نہ ہو آپ حقیقت کو کیسے مطابق حقیقت پائیں گے اصلاً حقیقت کچھ نہیں ہوتی، کانٹ کے الفاظ میں ہم حقیقت کو پا ہی نہیں سکتے، لہذا ہم حقیقت تخلیق کر سکتے ہیں یا اپنے ذہن کے خیالات وتصورات کو زمانے پر مسلط کر سکتے ہیں اور اسے ہی حقیقت قرار دیتے ہیں۔

سائنسی علم غلطی اور اصلاح کے اصولوں پر ترقی کرتا رہتا ہے جس نظریے کو جتنے زیادہ مشاہدوں سے غلط ثابت کیا جا سکتا ہو وہ اتنا ہی زیادہ سائنسی علم ہونے کا استحقاق رکھتا ہے ، نائیک صاحب کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ سائنسی طریقہ علم سے کسی بھی بیان کو صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا، البتہ غلط ثابت کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ سائنس میں سب کے سب قیاسات اور مفروضات ہوتے ہیں، حقیقت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی، نائیک صاحب کو بھی یہ ضرور معلوم ہوگا، کہ خود اہل سائنس نے تمام سائنٹفک تحقیقات کی ابتداء میں کس قدر مخالفت کی ہے اور جہاں بھی سائنس میں کبھی نئی دریافت یا تحقیقات ہوئی تو سب سے اول اس کی مخالفت میں اہل سائنس آستین چڑھا کہ سامنے آئے ہیں کوپرنیکس گلی لیو اور ہاروے کے نام سے کون واقف نہیں انہوں نے سائنس کی دنیا میں عجیب وغریب انکشافات کئے تھے لیکن ان کے نظریات اور انکشافات کے سب سے پہلے شدومد کے ساتھ مخالفت ان کے ہم عصر اہل سائنس نے کی تھی فلسفہ اور سائنس دونوں کی نامور شخصیت وہائٹ ہیڈ (white Head) اپنی کتاب Science and The modren world سائنس اور جدید دنیا میں کہتا ہے:

''سائنس مذہب یا دینیات سے بھی کہیں زیادہ تغیر پزیر ہو یا ناپائدار (Changable) ہوتی ہے سائنس کا کوئی آدمی گلیلو یا نیوٹن کی باتوں کو

غیر مشروطی طور پر (بلا تعدیل و تحدید) تائید نہیں کرسکتا ہے نہ خود اپنے دس سال قبل والے سائنسی اعتقادات Belifs کی۔'' [ص:۱۱۹]

آج طبیعیات (Physices) کا مقصد کسی طرح جواہر کی دنیا (Appearance World) کے پیچھے حقیقی دنیا Real Existence کو معلوم کرنا سرے سے رہا ہی نہیں بلکہ سائنسی نظریات کی نوعیت اب عقیدوں یا مسلکوں (Creeds) کے بجائے پالیسیوں (Policies) کی ہو کر رہ گئی ہے۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آج مشکل ہی سے تم کو کوئی ایسا رسالہ یا کتاب ملے گی جس میں ہمارے سائنسی خیالات سے بحث ہو اور اس کو اس طرح کے بیانات سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوگا، جو قرآن کے کسی ایک بیان کو بھی جدید سائنس کی روشنی میں غلط ثابت کر سکے۔ [خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک ص ۱۴۱ کتاب سرائے لاہور]

آپ قرآن میں کہیں بھی تضاد اور اختلاف نہیں پائیں گے اور نہ ہی قرآن کی کوئی آیت مصدقہ سائنسی حقائق کے خلاف ہوگی۔ [ص:۹۸]

قرآن کی ہزاروں آیات جدید سائنس کی روشنی میں غلط ہے:

نائیک صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کے کسی ایک بیان کو جدید سائنس کی روشنی میں کوئی غلط ثابت نہیں کرسکتا غلط ہے، قرآن میں بکثرت ایسے آیات موجود ہیں جو جدید سائنس اس سے انکار کرتی ہے۔

خدا موجود ہے جو کہ تمام مخلوقات کا رب ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الحمد للہ رب العالمین﴾ [الفاتحۃ: ۱]

﴿وللہ المشرق والمغرب فاینما تولو فثم وجہ اللہ ان اللہ واسع علیمٌ﴾ [البقرۃ: ۱۱۵]

﴿اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم﴾ [البقرۃ: ۲۵۵]

قرآن کہتا ہے خدا موجود ہے لیکن سائنس تو خدا کا انکار کرتی ہے کیونکہ سائنسی نظریہ میں اب انسان حواس ظاہرہ اور اپنی عقل کی بناء پر بالغ ہو چکا ہے اور اب کسی ماروائے انسان وجود یا ذریعے سے علم اور رہنمائی لینے کا محتاج نہیں وہ مستغنی ہے، جس خدا کو انسان نے اپنے عہد طفولیت میں اپنے سہارے اور تسلی کے لئے گھڑ لیا تھا اب اس خدا کی ضرورت نہیں، اس کے برعکس قرآن یہ علم اور یقین بخشتا ہے کہ خالق کا وجود حقیقی ہے وہی خالق حقیقی کھانا بھی کھلاتا ہے، شفاء بھی بخشتا ہے اختیار وقدرت بھی صرف اس کو حاصل ہے زندگی بسر کرنے کا صحیح راستہ بھی وہی دکھاتا ہے انسان ہر لحاظ سے اس کا فقیر اور غلام وبندہ ہے۔

قرآن مجید میں آخرت کا ذکر متعدد آیات میں آیا ہے مثلاً:

﴿من امن بالله واليوم الاخر وعمل صالحاً فلهم اجرهم عند ربهم ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون﴾ [البقرة ٦٢]

اس کے علاوہ البقرۃ :۸۶، النساء۱۶۲، ال عمران :۹، اور اس کے علاوہ تقریباً ۷۰ آیات میں آخرت کا ذکر ہے۔

نائیک صاحب جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کوئی شخص سائنس کی روشنی میں قرآن کی کسی بیان کو غلط نہیں ثابت کرسکتا ہے کیا وہ آخرت کو جدید سائنس سے ثابت کرسکتا ہے؟ وہ آخرت کو جدید سائنس سے ثابت کردے اس کے علاوہ صلوٰۃ کا ذکر ۶۷ مقامات پر، رسول پیغمبر انبیاء کا ذکر ۵۰۰ سے زائد مقامات پر جنت ۷۰ مرتبہ جہنم ۶۴ مرتبہ، جنات ۷۰ مرتبہ، قیامت ۲۶ مرتبہ کئے گئے ہیں لیکن ان میں کوئی بھی چیز جدید سائنس سے ثابت نہیں کی جاسکتی ہے، ان متعدد آیات کا سائنس کے ساتھ ٹکراؤ ہے، بلکہ جدید سائنس کی روشنی میں یہ آیات غلط ہیں۔

اس کے علاوہ معجزانہ طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کا اثر نہ کرنا، آناً فاناً معراج کا سفر بحالت بیداری، فرشتوں کا وجود ان سب چیزوں سے سائنس انکار کرتی ہے۔

ان سب آیات میں اور اس جیسے قرآن کے بے شمار احکامات وبیانات جو مافوق الحسی

اور مابعد الطبعی روحانی احوال و کیفیات سے تعلق رکھتے ہیں جس کا سائنسی دائرہ کار سے کوئی تعلق نہیں سائنس انکار کرتی رہتی ہے، کیونکہ وہ مشاہدات اور تجربات کے تحت نہیں آسکتیں ہیں گویا سائنس نے کائنات خدا، آخرت، کے سوالات کو بے کار قرار دیا ہے، کیونکہ سائنس کی حقیقت مخلوقات تک محدود ہے سائنس کے نزدیک ان چیزوں میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کو حیات و کائنات کی بقاء کے لئے ضروری اور لازمی سمجھا جاسکے یہ وجہ ہے کہ سائنس انہیں غیر ضروری مفروضات قرار دیتی ہے کہ حیات و کائنات کی تشریح ان مفروضات کے بغیر بھی اچھی طرح کی جاسکتی ہے یہی وجہ ہے کہ سائنس کا عقیدہ ان چیزوں میں تشکیک وارتیاب سے بڑھ کر انکار کا ہے۔

آیت ﴿ذالك الكتاب لاريب فيه﴾ اور سائنس:

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں سورۃ بقرۃ کی پہلی آیت میں قرآن مجید کا تعارف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ [البقرة:۱]

کہ اس کتاب میں کوئی شک وشبہ نہیں کیونکہ کسی کلام میں شک وشبہ کی دوصورتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ خود کلام میں غلطی ہو، تو وہ کلام محل شک وشبہ ہو جاتا ہے دوسرے یہ کہ سمجھنے والے کی فہم میں غلطی ہو اس صورت میں کلام محل شک وشبہ نہیں ہوتا گو کج فہمی یا کم فہمی کی وجہ سے کسی کو شبہ ہو جائے جس کا ذکر خود قرآن کریم میں چند آیتوں کے بعد ان کنتم فی ریب میں آیا ہے، اس لئے ہزاروں کم فہموں یا کج فہموں کے شبہات واعتراضات کے باوجود یہ کہنا صحیح ہے کہ اس کتاب میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ایک شخص کا ایمان اس وقت تک کامل اور معتبر نہیں ہوتا جب تک اس کا یہ عقیدہ نہ ہو کہ قرآن اور اسلامی تعلیمات شک اور تردد سے پاک ہیں، لیکن اس کے مقابل سائنسی تصور علم میں جس علم پر یقین ہو وہ سائنس کی دنیا میں علم ہی نہیں کہلاتا علم کی بنیاد پر علم کا آغاز اور علم کا انجام شک ہے شک ہی علم ہے شک سے ماوراء علم بلاشک وشبہ دائرہ علم

سے خارج ہے اور سائنسی تصور علم میں وہی نظریہ زیادہ مضبوط اور سائنسی ہوتا ہے جو زیادہ رد (Reject) اور غلط ثابت ہو جائے پاپر (Popper) خود اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ سائنس ہم اپنی غلطیوں سے سیکھتے ہیں انصاف کیجئے نائیک صاحب کا یہ دعویٰ کہ کوئی شخص قرآن کے کسی بیان کو جدید سائنس کی روشنی میں غلط ثابت کر سکے، نظریہ تردیدیت (Falsificationism) اور سائنسی تصور علم کی روشنی میں قرآن کی پہلی آیت غلط ہے۔

آیت ﴿ختم اللہ علی قلوبہم﴾ اور سائنس:

قرآن میں کئی مقامات پر یہ بات دہرائی گئی ہے کہ بدکردار لوگوں کے قلوب پر مہر لگادی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ [البقرة: ۷]

کسی چیز پر مہر اس لئے لگائی جاتی ہے کہ باہر سے کوئی چیز اس میں داخل نہ ہو سکے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگانے کا یہی مطلب ہی کہ ان میں قبول حق کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

موضع الفکر اور اعضاء انسانی میں رئیس ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دل پر مہر لگاتے ہیں علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر قرطبی میں لکھتے ہیں:

الرابعة: قوله (على قلوبهم) فيه دليلٌ على فضل القلب على جميع الجوارح والقلب للانسان وغيره وخالص كل شئ واشرفه قلبه فالقلب موضع الفكر. وهو في الاصل مصدرٌ قَلَبْتُ الشئ اقلبه قلباً اذا رددته على بدأته وقلبت الاناء، ردته على وجهه ثم نقل هذاالفظ فسميَّ به

هذاالعضو الذى هو اشرف الحيوان. لسرعة الخواطر اليه ولترددها عليه كما قيل.

ماسمي القلب الا من تقلبه
فاحذر على القلب من قلب وتحويل

[تفسير القرطبى ۱/۱۸۷ مكتبة الغزالى]

چونکہ موجودہ سائنس یہ دعویٰ کرتی ہے کہ سوچنے کا عمل تو ذہن سرانجام دیتا ہے جبکہ دل تو محض خون کی روانی برقرار رکھنے کی ایک مشین ہے لہذا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائنسی تحقیقات کی روشنی میں قرآن کی ان آیات کا کیا مطلب ہوگا ، لامحالہ یا تو ان آیات کو غلط کہیں گے یا غلط سلط تاویل کر کے ان کو جدید سائنس کی ہم اہنگ بنائینگے جو نائیک صاحب کرتے ہیں اور اسی سے متعلق ایک سوال کے جواب میں اسی طرح غلط سلط تاویل کیا ہے۔

نائیک صاحب اس لئے قرآن سے سب چیزوں کی اثبات کا کوشش کر رہا ہے کہ اس کے نزدیک کسی سائنسی نظریئے کا سائنس سے ثابت نہ ہونا قرآن کے لئے ایک عیب ہے، حالانکہ نائیک صاحب کو یہ غلط فہمی قرآن کے اصل موضوع کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے قرآن کوئی سائنس کی کتاب نہیں کہ جس میں فزکس، کمیسٹری، حیاتیات وغیرہ کی تفصیلات بیان کی گئی ہوں بلکہ قرآن کا اصل موضوع نوع انسانیت کو اس راستے کی طرف ھدایت کرنا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنے رب کے حضور سرخرو ہو سکے۔

چنانچہ کسی سائنسی نظریئے کا قرآن میں نہ ہونا کوئی عیب نہیں کیونکہ یہ قرآن کا موضوع ہی نہیں اگر کوئی شخص قانون کی کسی کتاب میں کسی سائنسی ایجاد کی وجہ سے پیدا ہونے والی قانونی پیچدگیوں کی تفصیلات دیکھ کر یہ طے کر لے کہ وہ سائنس کا ہر نظریہ اس کتاب سے نکالے گا تو ایسے شخص کی عقل پر ہر شخص ماتم کرے گا اور اس سے یہی کہے گا کہ بھائی یہ قانون کی کتاب ہے نہ کہ سائنس کی نیز اس میں اگر کوئی سائنسی بات زیر بحث لائی بھی گئی ہے تو اسے قانون ہی کے موضوع کے تحت سمجھنا چاہئے جس طرح قانون کی

کتاب میں طب، فزکس، کیمسٹری کی تفصیلات کا نہ ہونا کوئی عیب نہیں ایسے ہی قرآن میں سائنسی بیانات کا نہ ہونا کوئی عیب نہیں نیز جس طرح کسی قانون کی کتاب میں کسی سائنسی ایجاد تاریخی واقعے کے درج ہونے سے وہ سائنس یا تاریخ کی کتاب نہیں بن جاتی بالکل اسی طرح قرآن میں کسی سائنسی حقیقت کی طرف ضمناً اشارہ آ جانے سے قرآن سائنس کی کتاب نہیں بن جاتی بلکہ اس بیان کی صحیح تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ اسے قرآن کے عمومی موضوع کے تحت ہی سمجھا جائے کہ یہ بیان عقل اور ایمان والوں کے لئے اللہ کی نشانی ہے یا اس میں عقل والوں کے لئے عبرت کا سامان ہے وغیرہ دوسرے لفظوں میں قرآن کا کسی سائنسی حقیقت کو بیان کرنے کا مقصد ہرگز کسی سائنسی نظریئے کا داغ بیل ڈالنا، لوگوں کو سائنس سکھانا یا انسانوں کو تسخیر کائنات پر ابھارنا نہیں بلکہ ہدایت انسانی کی خاطر اسے ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے جس پر غور کر کے وہ اصل حقیقت تک پہنچ کر خود کو اپنے رب کے حضور جھکا دے۔

نائیک صاحب کا یہ کہنا کہ قرآن کا کوئی بیان جدید سائنس کی روشنی میں غلط نہیں ہو سکتی، اس کی کم علمی اور سائنس سے بے پناہ مرعوبیت پر دال ہے، حالانکہ متعدد آیات قرآنی کا سائنس کے ساتھ ٹکراؤ ہے، جیسا کہ کچھ پہلے بیان ہوا اور دوسرا یہ کہ اگر کوئی چیز سائنس سے ثابت نہیں کیا جا سکے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ علم نہیں مثلاً محبت ایک جذبہ ہے جس کی وجود ہے لیکن سائنسی منہاج علم میں اس کو ثابت نہیں کیا جا سکتا ہے محبت کے جذبے کا ریاضیاتی جائزہ نہیں لیا جا سکتا ہے کتنی محبت ہے؟ کیسی محبت ہے؟ کہاں تک محبت ہے؟ اس کی کم و کیف کو محسوس کرنے کی سکت نہیں رکھتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ چیز غلط ہے یا اس کی کوئی حیثیت نہیں، نائیک صاحب قرآن کو جدید سائنس سے ثابت کرنے اور تصدیق کرنے کی کوشش اس لئے کرتا ہے کہ اس کے نزدیک ہر چیز کے پرکھنے اور جانچنے کا پیمانہ سائنس ہے، لہذا جو چیز سائنس کی نظر میں نہ آئے تو وہ اس کے نزدیک قابل اعتبار نہیں ہوگی، حالانکہ اس صدی کا ئن سٹائن فائن اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

If a thing is not a science it is not

necessarily bad,for example love is not a science so if someting is said not to be a science, it does not mean that there is something wrong with it, just means that it is not a science [Capter 3 The Relation of physics to other science in "Six Easy pieces" at page No 48 1995 Helix Books USa]

لہٰذا نائیک صاحب کا سائنس کو العلم اور حقیقت مطلق سمجھنا غلط ہے اور ساتھ ساتھ قرآن کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا سراسر کم علمی پر موقوف ہے کیونکہ سائنس آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا ہونا نہیں مانتی ہے عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا ہونا نہیں مانتی ہے،قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبع طَرائقَ﴾

سائنس دان طرائق کو نہیں مانتے معجزات کو نہیں مانتے اسی طرح قرآن میں ہے:

﴿ان الساعة لاتية لاريب ولكن اكثر الناس لايومنون﴾

قیامت کے دن کو سائنس نہیں مانتی ،اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ثم الله ينشئ النشاة الاخرة﴾[عنکوبت:۲۹]

دوبارہ جی اٹھنا سائنس نہیں مانتی ،تو پھر سائنس جو اٹکل بچو طریقے سے چلتی ہے جس کی کوئی سند نہیں جو نہایت متغیر اور متنوع جنس ہے جو ہر لمحے تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہے جس کا پورا کارخانہ قیاس وگمان ،تخمینوں اور اندازوں بلکہ سادہ لفظوں میں غلط بیانی پر منحصر ہے،نائیک صاحب کا اس کی مطابقت قرآن سے ثابت کرنا انتہائی ظلم ہے۔

ہمیں کسی کا کتاب مطالعہ کرتے ہوئے الفاظ کے وہی معنیٰ سامنے رکھنے چاہئیں جو اس وقت مراد لئے جاتے تھے جب کتاب تحریر ہوئی تھی یا وہی معنیٰ قبول کرنے چاہئیں جو معنیٰ اولین مخاطبین کے نزدیک درست تھے لیکن یہ بیان صرف بائبل کے بارے میں درست ہے کیونکہ اس کے مخاطبین صرف اسی دور کے لوگ تھے قرآن کا معاملہ مختلف ہے

قرآن صرف اس دور کے عربوں کے لئے نازل نہیں ہوا تھا قرآن کا پیغام صرف مسلمانوں کے لئے بھی نہیں ہے یہ تو پوری انسانیت کے لئے پیغام ہدایت ہے۔

[ص:۵۳ خطبات ذاکر نائیک]

آپ قرآنی الفاظ کے معنیٰ کو قطعاً اس دور تک محدود نہیں کر سکتے جس دور میں یہ نازل ہوا تھا۔ [خطبات ذاکر نائیک ص:۵۴]

نائیک صاحب کا یہ کہنا اس بات کی مترادف ہے کہ اولین مخاطبین کا تفسیر حتمی یقینی اور قطعی نہیں ہے، تفسیر ماثور عن الصحابۃ والتابعین مقبول نہیں بلکہ اس کے نقطہ نظر کے مطابق زمان ومکان (Time and Place) بدل جانے سے معانی بدل جائینگے، زمانہ صحابہ اوران کی معانی قرآن وتفسیر بالکل لایعنی ہے، کیونکہ نائیک صاحب کہتے ہیں کہ آیات کے معانی زمانہ کے بدلنے اور سائنس کے ارتقاء پذیر ہونے کے ساتھ ساتھ بدلتے جائیں گے کیونکہ اس کی معانی حتمی نہیں۔

نائیک صاحب کا یہ کہنا درست نہیں کیونکہ اس طرح کرنے سے ہر آدمی قرآن کو جدید زمانے پر تطبیق کر کے قرآن سے اپنے مطلب کا معانی اخذ کرے گا زمانے کے کسی چلن کو پہلے اپنی عقل سے صحیح اور بہتر قرار دے گا اور اس کے بعد قرآن وسنت کو اپنے اس عقلی فیصلے پر فٹ کرنے کے لئے ان میں کھینچ تان اور اور غلط تاویلات کا طریقہ اختیار کرے گا، یہ طرز عمل احکام الٰہی کا اتباع نہیں کہلا سکتا، یہ اتباع کے بجائے تحریف ہوگی، جس کا کسی انسان کو اختیار نہیں کیوں کہ اس سے احکام الٰہی کا مقصد نزول بے کار ہو جائے گا، علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں اس شخص کے بارے میں کہتا ہے جو صحابہ اور تابعین کے ماثور تفسیر سے ہٹ کر تفسیر اور معانی بیان کرتا ہے۔

فانّ الصّحابة والتابعين والائمة اذا كان لهم فى الاية تفسيرٌ وجاء قومٌ فسرّوا الاية بقول اخر لا جل مذهب اعتقدوه وذالك المذهب ليس من مذاهب الصحابة والتابعين صار مشاركاً للمتعزله وغيرهم من اهل البدع

فی مثل ھذا وفی الجملة من عدل عن مذاھب الصحابة والتابعین وتفسیرھم الیٰ مایخالف ذالك كان مخطئافی ذالك بل مبتدعاً لانهم كانوا اعلم بتفسیره ومعانیه كما انهم اعلم بالحق الذی بعث الله به رسوله......

[الاتقان فی علوم القرن: ۱۷۸/۲ سهیل اکیڈمی]

ترجمہ: ’’ جب صحابہ تابعین اور ائمہ کی کوئی تفسیر موجود ہو اور کوئی قوم آ جائے اور آیت کی تفسیر کسی دوسرے قول پر کرے اپنی مذہب کی اعتقاد کی وجہ سے اور یہ مذہب صحابہ اور تابعین کی مذاہب سے نہ ہو تو یہ شخص معتزلہ اور اہل بدع کے ساتھ شریک ہوگا، اور بالجملہ جس نے صحابہ اور تابعین اور ان کی تفسیر سے عدول کی تو یہ شخص مخطی بلکہ مبتدع ہوگا صحابہ کرام جس طرح دین کے بابت میں زیادہ سمجھدار تھے، اسی طرح وہ قرآن کے معانی اور تفسیر کے زیادہ سمجھدار تھے، جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بھیجا تھا۔

قرآن کی تعلیمات سدابہار ہیں:

قرآن وہ ہدایت کی کتاب ہے جو گم گشتہ راہ لوگوں کی رہنمائی کے لئے نازل ہوئی ہے اس کا مقصد اور محور ایمان ویقین معرفت خالق اور روحانیت کی طرف دعوت دینا صحیح معنیٰ میں انسانی مسائل اور ضروریات کا حل کرنا اور اس زندگی کو حیات جاودانی کا ذریعہ بنانا ہے۔ اس لئے اس قرآن کی تعلیمات سدابہار ہیں زمانے میں کیسے ہی انقلاب رونما ہو جائیں حالات کتنے ہی پلٹے کھالیں، وہ پرانا نہیں ہوتا، آج بھی تازہ ہے اور جب تک یہ دنیا کروٹیں بدلتی رہے گی وہ تازہ رہے گا اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے اس کے اصول وضوابط کسی بشریٰ ذہن نے مرتب نہیں کئے، جو آنے والے حالات سے بے خبر ہو، اس کی تعلیمات کا سرچشم وحی الٰہی ہے جس ذات نے اسے انسان کا نظام حیات قرار دیا ہے

وہی انسان اور اس تمام کائنات کا خالق ہے اسے انسان کی فطرت کا پورا علم ہے وہ اس کی ضرورتوں کو خوب جانتا ہے، وہ تمام بدلتے ہوئے حالات سے پوری طرح باخبر ہے اور اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ کب کیا ہونے والا ہے؟ یہ اسی کے کلام کا اعجاز ہے کہ اس نے اسلام کے جو اصول وقواعد قرآن کریم میں بیان فرمائے اور جن کی تلقین اس کے آخری پیغمبر ﷺ نے کی وہ قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام مسائل پر حاوی ہیں یہ دنیا لاکھ کروٹیں بدل لیں، ان تعلیمات کو بدلنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آسکتی۔

نائیک صاحب کے نقطہ نظر کے مطابق کہ پیغام آسمانی ہوگی اور تشریح انسانی اور سائنسی ہوگی اور عہد بہ عہد بڑھتا پھیلتا سائنسی علم مہیا کرے گا بالکل غلط ہے اگر قرآن وسنت کا منشاء یہ ہوتا کہ ہر زمانے کے مسلمان اپنے حالات کے مطابق اور سابق امت کے اجماعی فیصلوں کے خلاف خود تشریح کر کے اسے صحیح تشریح وتفسیر قرار دے گا، تو قرآن وسنت کو زندگی کے ہر گوشے میں اس قدر تفصیلی احکام دینے کی کیا ضرورت تھی؟ بس اتنا کہہ دیا جاتا کہ ہر زمانے میں اپنے ماحول کے پیش نظر قوانین بنالیا کرو، اس کے برخلاف قرآن وسنت اور اجماع امت کے جو احکام معین طور پر بتلا دیئے ہیں ان کا واضح مطلب ہی یہ ہے کہ وہ قیامت تک کے لئے نافذ ہوں گے اور کسی زمانے میں انہیں تبدیل نہ کیا جاسکے گا۔

نائیک صاحب کا اس طرح کہنے کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ قرآن کی کوئی معنیٰ ہی نہیں بلکہ جو شخص زمانے کے حالات کے مطابق جیسا ہی معنیٰ مراد لے گا بس وہی ٹھیک رہے گا ظاہر ہے نائیک صاحب کا یہ موقف غلط اور گمراہی کی طرف لے جانے والا ہے۔

تخلیق انسان، سائنس اور نائیک صاحب:

قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی زندگی کا ارتقاء کم وبیش سات مرحلوں سے گزر کر تکمیل پذیر ہوا جو درج ذیل ہیں:

(۱) تراب Inorganic Matter.

(۲) ماء	Water.
(۳) طین	Clay.
(۴) طین لازب	Adsorbable or Adsorptive clay
(۵) صلصال من حماء مسنون	Old, Physically & Chemically Altered mud.
(٦) صلصال کالفخار	Dried and Highly Purified Clay.
(۷) سلالۃ من طین	Extact of Purified Clay.

(۱) تراب: Inorganic Matter

﴿وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ تُرَابٍ﴾ [المؤمن]

وہی ہے جس نے تمہیں مٹی یعنی غیر نامی مادے سے بنایا اس آیت کریمہ میں آگے حیاتیاتی ارتقاء کے بعض مراحل کا بھی ذکر کیا گیا ہے، مثلاً:

﴿ ثم من نطفةٍ ثم من علقةٍ ثم يخرجكم طفلاً﴾

لیکن قابل توجہ پہلو یہ بھی ہے کہ انسانی زندگی کے ان ارتقائی مرحلوں کا ذکر باری تعالیٰ نے اپنی صفت رب العالمین کے بیان سے شروع کی ہے اس سے پہلی آیت کی آخری الفاظ یہ ہیں:

﴿و امرت ان اسلم لرب العالمين﴾ [المومن:٦٦]

اور مجھے حکم ہوا ہے کہ اس کے سامنے گردن جھکاؤں جو سارے عوالم اوران کے مظاہر حیات کو درجہ بدرجہ مرحلہ وار کمال تک پہچانے والا ہے۔

یہاں اپنی شان رب العالمین کا ذکر کر کے ساتھ ہی دلیل کے طور پر انسانی زندگی کا ارتقاء ذکر کردیا گیا ہے جس سے واضح طور پر یہ سبق ملتا ہے کہ قرآن باری تعالیٰ کے رب العالمین ہونے کو انسان زندگی کے نظام ارتقاء کے ذریعے سمجھنے کی دعوت دے رہا ہے کہ اے نسل بنی آدم! ذرا اپنی زندگی کے ارتقاء کے مختلف ادوار و مراحل پر غور کرو کہ تم

کس طرح مرحلہ وار اپنی تکمیل کی طرف لے جائے گئے کس طرح تمہیں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل کیا گیا اور کس طرح تم بالاخر احسن تقویم کی منزل کو پہنچے، کیا یہ سب کچھ رب العالمین کی پرورش کا مظہر نہیں ہے جس نے تمہیں بجائے خود ایک عالم بنا دیا ہے۔

(۲) ماء :(Water)

وھو الذی خلق من الماء بشرًا. [الفرقان ۵۴]

ترجمہ:''اور وہی ہے جس نے آدمی کی تخلیق پانی سے کی۔''

آیت کریمہ میں بھی تخلیق انسانی کے مرحلے کے ذکر کے بعد باری تعالیٰ کی شان ربوبیت کا بیان ہے۔

و کانَ رَبُّكَ قديرًا .[الفرقان ۵۴]

ترجمہ:''اور تمہارا رب قدرت والا ہے۔''

گویا یہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ تخلیق انسانی کا یہ سلسلہ باری تعالیٰ کے نظام ربوبیت کا مظہر ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا۔

﴿ وجعلنا من الماء كُلَّ شئٍ حي افلا يؤمنون ﴾ [الانبیاء ۳۰]

اور ہم نے جاندار چیز کو پانی کے ذریعے تخلیق کیا، وہ (پھر بھی) ایمان نہیں لاتے؟

(۳)طین :(Clay)

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ طِیْنٍ﴾ [الانعام۲]

ترجمہ:''وہی ہے جس نے تمہیں گارے سے بنایا''۔

یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ مترجمین قرآن نے بالعموم تراب اور طین دونوں کا معنیٰ مٹی کیا ہے جس سے ایک مغالطہ پیدا ہوسکتا ہے کہ آیا یہ دو الگ مرحلے ہیں یا ایک ہی مرحلے کے دو مختلف نام اس لئے ہم نے دونوں کے امتیاز کو برقرار رکھنے کے لئے طین

کا معنیٰ گارا کیا ہے، تراب اصل میں خشک مٹی کو کہتے ہیں، امام راغب فرماتے ہیں: **التراب الارض نفسها** (تراب سے مراد فی نفسہ زمین ہے) جبکہ طین اس مٹی کو کہتے ہیں جو پانی کے ساتھ گوندھی گئی ہو جیسا کہ مذکور ہے۔

الطین: التراب والماء المختلط: [المفردات]

مٹی اور پانی باہم ملے ہوئے ہوں تو اسے طین کہتے ہیں اسی طرح کہا گیا ہے **الطین: التراب الذی یجبل بالماء** [المنجد] طین سے مراد وہ مٹی ہے جو پانی کے ساتھ گوندھی گئی ہو (اسی حالت کو گارا کہتے ہیں)

اسی لحاظ سے یہ ترتیب واضح ہو جاتی ہے مٹی، پانی، گارا۔

(۴) طین لازب: (Adsorbable)

﴿انّا خلقنا هم من طین لّازب﴾ [الصافات]

ترجمہ: ''بیشک ہم نے انہیں چمکتے گارے سے بنایا۔''

طین لازب: طین کی اگلی شکل ہے۔ جب گارے کا گاڑھا پن زیادہ ہو جاتا ہے، تو کہا گیا ہے۔

اذا زال عنه (الطین) قوة الماء فهو طین لازب

''جب گارے سے پانی کی سیلانیت زائل ہو جائے''

تو اسے طین لازب کہتے ہیں یہ وہ حالت ہے جب گارا قدرے سخت ہو کر چپکنے لگتا ہے۔

(۵) صلصال من حماءٍ مسنون:

Old. Physically and Chemically Altered mud.

﴿ولقد خلقنا الانسان من صلصالٍ م حماءٍ مسنون﴾ [الحجر]

ترجمہ: ''اور بے شک ہم نے انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے بنایا، جو اصل میں ایک سیاہ بودار گارا تھی۔''

صلصال:

اس آیت کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ تخلیق انسانی کے ارتقاء میں یہ مرحلے طین لازب کے بعد آتا ہے یہاں صلصال (بجتی مٹی) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کی اصل صلصل ہے، اس کا معنیٰ ہے۔

تردد الصوت من الشیٔ الیابس سمی الطین الجاف صلصالاً. [المفردات]

حمی:

حرارت اور بخار کو کہتے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ پتنے کھولنے اور جلنے وغیرہ کے معنوں میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿تصلی ناراً حامیة﴾ [الغاشیة]

ترجمہ: ''جائیں گے بھڑکتی آگ میں''۔

﴿یوم یحمیٰ علیها فی نار جهنم﴾ [التوبه]

ترجمہ: ''جس دن وہ جہنم کی آگ میں بتایا جائے گا''۔

﴿لایذوقون فیها برداً ولاشراباً الاّ حمیماً﴾ [النباء]

''اس میں نہ تو کسی طرح ٹھنڈک کا مزہ پائیں گے اور نہ کچھ پینے کے سوائے کھولتے پانی کے۔''

الغرض ''حماء'' میں اس سیاہ گارے کا ذکر ہے جس کی سیاہی تپش اور حرارت کے باعث وجود میں آئی ہو گویا یہ لفظ جلنے اور سڑنے کے مرحلے کی نشانی کر رہا ہے۔

مسنون:

اس سے مراد متغیر اور بدبودار ہے یہ سن سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ صاف کرنے چمکانے اور صیقل کرنے کے بھی ہے مگر یہاں اس سے مراد متغیر ہو جانا ہے جس کے نتیجے

میں کسی شئے میں بو پیدا ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿فانظر والی طعامك وشرابك لم يتسنّه﴾ [البقرة]

پس اپنے کھانے اور مشروب کی طرف دیکھو [طویل زمانہ گزر جانے کے باوجود] متغیر اور بودار نہیں ہوا یعنی تازہ رہا جب گارے ''طین لازب'' پر طویل زمانہ گزرا اور اس نے جلنے سڑنے کے مرحلے عبور کئے تو اس کا رنگ بھی متغیر ہر کر سیاہ ہو گیا اور جلنے کے اثر سے اس میں بو بھی پیدا ہو گئی اسی کیفیت کا ذکر **صلصال من حماءٍ مسنون** میں کیا جا رہا ہے۔

صلصالٍ من حماءٍ مسنون [الحجر] اس بجتی مٹی سے تخلیق کی جس کی اصل بد بو دار گارا تھا۔

گویا لفظ صلصال واضح کر رہا ہے کہ اس مرحلے تک پہنچتے پہنچتے مٹی کی سیاہی اور بد بو وغیرہ سب ختم ہو چکی تھی اور اس کی کثافت بھی کافی حد تک معدوم ہو چکی تھی۔

صلصالٍ کالفخار: (Dried & highly pured clay)

اس مرحلے کی نسبت ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿خلق الانسان من صلصال کالفخار﴾ [الرحمٰن]

اس نے انسان کو ٹھیکری جیسی خشک پکی ہوئی مٹی سے پیدا کیا جب تپانے اور جلانے کا عمل مکمل ہوتا ہے تو گارا پک کر خشک ہو جاتا ہے اس کیفیت کو کالفخار سے تعبیر کیا گیا ہے اس تشبیہ میں دو اشارے ہیں:

(الف) ٹھیکرے کی طرح پک کر خشک ہو جانا۔

(ب) کثافتوں سے پاک ہو کر نہایت اور عمدہ حالت میں آ جانا۔

تخلیق انسانی کے ارتقاء جب صلصال کالفخار کے مرحلے تک پہنچی تو ٹھیکری کی طرح خشک ہو چکی تھی اور کثافتوں سے پاک ہو کر نہایت لطیف اور عمدہ مادے کی حالت اختیار

کر چکی تھی، گویا اب ایسا پاک، صاف، نفیس، عمدہ اور لطیف مادہ تیار ہو چکا ہے کہ اسے اشرف المخلوقات کی بشرئیت کا خمیر بنایا جا سکے۔

سلالۃ من طین :(Extrect of purified clay)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ولقد خلقنا الانسان من سللٰۃٍ من طین ﴾[المومنون]

ترجمہ: ''اور بے شک ہم نے انسان کو مصفّیٰ (چنے ہوئے) گارے سے بنایا''۔

یہاں طین لازب کے تزکیہ وتصفیہ Process of purification کا بیان ہے، سلالۃ سلَّ یَسُلُّ سے مشتق ہے جس کا معنیٰ ہے نکلنا، چننا اور میل کچیل سے اچھی طرح صاف کرنا شامل ہے، امام راغب لکھتے کہ سلالۃ من طین سے مراد الصفو الذی یسیل من الارض ہے۔ یعنی مٹی سے چنا ہوا وہ جوہر جیسے اچھی طرح پہلے پن سے پاک صاف کر دیا گیا ہو، جس تلوار کی دھار خوب تیز کی گئی ہو اسے السیف السلیسل کہتے ہیں، العرض سللۃ اس وقت وجود میں آتا ہے جب کسی چیز کو اچھی طرح صاف کیا جائے اس کے کثافتوں اور میلے پن کو ختم کیا جائے اور اس کے جوہر کو مصفیٰ اور مزکی حالت میں نکالا جائے گویا سللۃ کا لفظ کسی چیز کی اُس لطیف ترین شکل پر دلالت کرتی ہے جو اس چیز کا نچوڑ اور جوہر کہلاتی ہے مٹی سے انسان کی تخلیق کی مختلف صورتوں کی نوبت اس وجہ سے آئی کہ ایمبر یالوجی اور جدید سائنس نطفے سے لے کر رحم کے مراحل کو تو تسلیم کرتی ہے لیکن جدید سائنس کا کوئی سائنس دان انسان کی مٹی سے تخلیق کے نظریئے کو تسلیم نہیں کرتا، ان کا موقف یہ ہے کہ انسان مادہ سے ظہور کرتا ہے اور یہ مادہ (Protein cell) سے تخلیق پاتا ہے قرآن کا بیان ہے کہ تخلیق انسانی مٹی سے ہوئی اور تکرار کے ساتھ ہے کہ ہم نے انسان کو ارض سے، طین سے تراب سے پیدا کیا ہے لیکن کوئی جدید فلسفی یا سائنس دان انسان کی مٹی سے تخلیق کا قائل نہیں، حضرت عیسی علیہ السلام کی آمد سے قبل بعض یونانی فلاسفہ (Atomist) انسان کی مٹی سے تخلیق

کے قائل تھے، لہذا قرآن کے تمام وہ بیانات جو انسان کی مٹی سے تخلیق کے بارے میں ہیں سائنس کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ (نعوذ باللہ)

جب سائنس انسان کی ابتدائی ارتقائی مرحلے سے انکار کرتی ہے تو پھر اور مراحل کی سائنس سے موافقت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیونکہ بعض کا انکار اور بعض کا اقرار کا کیا فائدہ؟ اسی طرح سائنس کی انسان کا مٹی سے پیدا ہونے کے انکار کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ادم علیہ السلام کا انکار ہے، اور کسی ایک نبی کا انکار سارے انبیاء کا انکار ہوتا ہے، لہذا سائنس سارے انبیاء کی انکار کرتی ہے، تو پھر اس سائنس کی اسلام کاری کیسی ہو سکتی ہے؟ جو نائیک صاحب دن رات اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

رحم مادر میں تخلیق انسانی سے متعلق ایات اور نائیک صاحب:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد آیات میں تخلیق انسانی کے مراحل کا ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(۱) ﴿یایها الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقنکم من تراب ثم من نطفةٍ ثم من علقةٍ ثم من مضغةٍ مخلفةٍ وغیر مخلفةٍ لنبیّن لکم ونقرفی الارحام مَا نشاءُ الٰی اجلٍ مُسمًّی ثم نخرجکم طفلاً ثم لتبلِغُوٓا اشدکم ومنکم من یتوفی ومنکم من یردُ الٰی ارذل العمر لکیلا یَعْلَمُ من بعد علم شیئاً وتریٰ الارض هامِدَةً. فاذآانْزَلْنا علیها المآءَ اهتزت وربت وانبتت من کل زوج بهیج﴾

(۲)﴿ثم جعل نسله من سلالة من ماء مهین﴾

(۳) ﴿الم نخلقکم من ماءٍ مهین﴾

(٤)﴿ خلق من ماء، دافق ٥ یخرج من بین الصلب والتراب﴾.

(٥)﴿ اناخلقنا الانسان من نطفةٍ امشاج نبتلیه فجعلنه

سمیعاً بصیراً﴾.
(٦)﴿ ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طين﴾
(٧)﴿ خلق الانسان من علق﴾
(٨)﴿من نطفةٍ اذا تمنیٰ﴾
(٩)﴿الم يك نطفةً من منی یمنیٰ﴾
(١٠)﴿ ثم كان علقة فخلق فسویٰ﴾

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جہاں بھی تخلیق انسان کے مختلف مراحل بیان کی ہیں اس سے آگے پیچھے اپنی ربوبیت، حیات بعد الموت قیامت پر استدلال کی ہیں اور فرمایا ہے کہ جس طرح ابتدائی تخلیق ہماری قدرت سے خارج نہیں، اسی طرح دوبارہ تخلیق بھی ہماری قدرت میں داخل ہے ہم دوبارہ بھی پیدا کردیں گے، علامہ الدکتور وحبۃ الزحیلی فرماتے ہیں:

انّ فی مراحل خلق للانسان المذكورة لدليلاً واضحاً وبياناً قاطعاً يدل على كمال قدرة الله تعالیٰ.

[التفسير المنير ١٧/١٦٣]

ترجمہ: ''مذکورہ تخلیق انسان کے مراحل میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر واضح اور قاطع دلیل ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

انّ خلق الانسان والنبات حاصل بالله وهو السبب فی حصوله ولولاه لم يتصور وجوده فان اللّٰه هو الحق ای الثابت الموجود ، وأنّه قادرٌ على احياء الموتیٰ وعلی کل مقدور وانّه حكيم لايخلف ميعاده وقد وعد الساعة والبعث ، فلابد ان يفیَ بما وعد وانه عالم بكل شئٍ وقادر على جميع ذرات الانسان المتفرقة فی انحاءِ الارض

اوقیعان البحار اواجواف الحیوانات اوفی ای مکان. [التفسیر المنیر ۱۷/۱٦٤]

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر ''الجامع الاحکام القرآن'' میں ''یاایھا الناس ان کنتم فی ریب من البعث ایت کی تفسیر کے بعد فرماتے ہیں:

''یاایّھاالناس ان کنتم فی ریب من البعث الیٰ قول البھیج'' قال بعد ذلك''ذلك بانّ اللّٰہ ھو الحق فأنّہ یحی الموتیٰ وانہ علی کل شیٔ قدیر، وان الساعۃ اتیۃٌ لاریب فیھا وان اللّٰہ یبعث من فی القبور فنبہ سبحانہ وتعالیٰ بھذا علی ان کل ماسواہ وان کان موجودا حقاً فانہ لا حقیقۃ لہ من نفسہ لانّہ مسخَّرٌ مصرّفٌ والحق الحقیقی: ھو الموجود المطلق الغنی المطلق..........

[الجامع الاحکام القرآن ۱۲/۱٤]

''علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر ''تفسیر عثمانی'' میں یا ایھا الناس ان کنتم فی ریب امن البعث آیت کے تفسیر میں فرماتے ہیں کہ انسان کی پیدائش اور کھیتی کی مثالوں سے جو اوپر مذکور ہوئیں چند باتیں ثابت ہوتی ہیں''

(۱) یہ کہ یقیناً اور بالتحقیق اللہ موجود ہے ورنہ ایسی منظّم، متقن اور حکیمانہ صنعتیں کہاں سے ظاہر ہوئیں۔

(۲) یہ کہ خدا تعالیٰ مردہ اور بے جان چیزوں کو زندہ اور جاندار بنا دیتا ہے چنانچہ مشت خاک یا قطرہ اب سے انسان بنا دینا اور افتادہ زمین میں روح نباتی پھونک دینا اس پر شاہد ہے، پھر دوبارہ پیدا کر دینا اس کو کیا مشکل ہے۔

(۳) یہ کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اگر ہر چیز اس کی قدرت کے نیچے نہ ہوتی تو

ہرگز یہ کام نہیں کرسکتا تھا۔

(۴) یہ کہ قیامت ضرور آنی چاہئے اور اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ضرور ملنی چاہئے کیونکہ اتنے بڑے انتظامات یوں ہی لغو اور بیکار نہیں ہو سکتے جس حکیم مطلق اور قادر علی الاطلاق نے اپنی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ سے انسان کو ایسی عجیب وغریب صفت کے ساتھ پیدا کیا، کیا خیال کیا جاسکتا ہے، کہ اس نے اس کی زندگی بے کار بنائی ہوگی؟ ہرگز نہیں، یقیناً انسان کی یہ محدود زندگی جس میں سعادت وشقاوت نیکی بدی اور رنج وراحت، باہم مخلوط رہتے ہیں اور امتحان وانتقام کی صورتیں ایک دوسرے سے مکمل اور نمایاں طور پر متمیز نہیں ہوتیں، اس کو مقتضی ہے کہ کوئی دوسری زندگی ہو جہاں سعید وشقی، مجرم، وفادار صاف طور پر الگ الگ ہو اور ہر ایک اس مقام پر پہنچایا جائے جہاں پہنچنے کے لئے بنایا گیا ہے اور جس کی استعداد اپنے اندر رکھتا ہے۔ [تفسیر عثمانی ۲/۱۳۱]

نائیک صاحب جینیات (Embryology) کو قرآنی آیات سے ثابت کرنے اور پھر قرآنی آیات سے سائنس کی تائید اور تصدیق کرنے کے لئے جہاں بہت سے آیات پیش کرتے ہیں وہاں یہ آیت:

﴿یَایها النَاسُ اِنْ کُنتُمْ فِی رَیْبٍ مِنَ الْبَعْثِ الخ﴾

بھی پیش کرتے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ ان آیات میں انسانی مراحل تخلیق ذکر کرنے کا مطلب اثبات قیامت، اثبات خداوندی، اور اللہ تعالیٰ کا قادر مطلق بیان کرنا ہے۔ خاص کر ”یا یھا الناس ان کنتم فی ریب من البعث “ میں ابتدا انسان کی تخلیق مٹی سے بیان کیا ہے۔ جو سائنس نہیں مانتی، اور اختتام اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے اور اثبات قیامت پر ہے۔ جس سے بھی سائنس انکار کرتی ہے۔ تو اگر یہ درمیان والا حصہ سائنس مانے اور قرآن کا اس کے ساتھ تطبیق کی جائے تو کیا ہوگا؟ لہذا نائیک صاحب کا قرآن اور سائنس کی تطبیق کرنا اور ہر ایت سے سائنس کی کوئی نہ کوئی علم برآمد کرنا غیر

علمی اور غیر اخلاقی رویہ ہے۔ کیونکہ قرآن کی آیات کا مقصد ان سائنسی اصولوں کو بیان کرنا تھا۔ اور نہ ہی اس غرض سے اس کا نزول ہوا ہاں ہر سبیل تذکرہ ایسے متعدد چیزیں بیان کردیئے گئے ہیں جو سائنسی علم کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم یہ دعویٰ کرے کہ قرآن میں کوئی سائنسی غلطی نہیں ہے اور قرآن سے سائنس کی تائید اور تصدیق شروع کردے، کیونکہ سائنس چونکہ ایک ظنی علم ہے، اور اس میں تناسب امکان Degree of Probability خاصی زیادہ ہے، اس لئے آیات قرآنی کی تمام سائنسی تعبیرات کو معنیٰ قرآن کے حوالے سے ہمیشہ حتمی و قطعی قرار نہیں دینا چاہئے، سائنسی نظریئے بدلتے رہتے ہیں آئے روز نت نئ نظریات جنم لے رہی ہے تو اگر آج ہم قرآن کا سائنس کے ساتھ تطبیق کرے اور کل اگر یہ نظریہ رد (Reject) ہوا تو پھر کیا (نعوذ باللہ) قرآن کو غلط کہیں گے، یا اس میں تحریف وتاویل کرے گے۔

ایک غیر مسلم اور دھریئے کے لئے شاید اصل معیار جدید سائنس ہو، لہذا میں انہی کے معیار انہی کے پیمانے کو استعمال کرتے ہوئے قرآن کی برتری کا ثبوت فراہم کرتا ہوں تاکہ وہ قرآن پر ایمان لائیں۔ خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک۔ [ص:۱۲۶ کتاب سرائے لاہور]

غیر مسلم کا اصل معیار سائنس نہیں، نفس ہے:

نائیک صاحب کا یہ کہنا کہ ایک غیر مسلم کے لئے اصل معیار جدید سائنس ہے صحیح نہیں بلکہ آج غیر مسلم کے لئے اصل معیار جدید سائنس کے بجائے اس کا نفس (Self) اور خواہشات نفسانی ہے، اب مغرب میں جدید انسان ایک لذت پسند جانور "Man is a pleasure seeking animal" بن چکا ہے۔ زندگی کے اعلی معیار کا حصول اور لذات تک اس کی پہنچ اس کا اصل مقصود وھدف ہے، اس کا سائنس اور فلسفے سے کوئی غرض نہیں، آج شریف انسان Gentelmen وہ ہے، جس کے پاس دولت ہو آج لوگ ارسطو اور سقراط کو بھول گئے ہیں لوگ صرف اسمتھ کو جانتے ہیں، اس لئے کہ وہ سرمایہ داری کا نظام پیش کرر ہا ہے۔

نائیک صاحب اگر سائنس کو پیمانہ ٹھہرا کر عقلی گھوڑے دوڑا رہے ہوں گے تو پھر ایمان کی تازگی کے لئے ہر روز سائنسی ایجادات کی مثالیں دینے پڑیں گے، اور اگر نائیک صاحب کے قول کے مطابق سائنس کی مثال اس وجہ سے پیش کرتا ہوں تاکہ وہ ایمان لائیں، تو سوال یہ ہے کہ مغرب میں کتنے لوگ طبیعیات میں مظاہرہ خداوندی دیکھنے کے بعد روحانی وجدان کے ذریعے حقیقت مطلق تک پہنچے؟ سائنس دانوں کی تاریخ پڑھ لیجیے، کتنے سائنس دان اثار کائنات محسوسات اور تجربات کے ذریعے مابعد الطبیعات تک پہنچے، اگر صرف مظاہر کائنات اور طبعیات سے خالق مل سکتا تو مغرب کے ہر جدید انسان اور ہر سائنس دان خدا کی معرفت حاصل ہوجاتی اور مغرب کا ہر سائنس دان یا وسیع المطالعہ شخص صوفی اور درویش ہوتا، مغرب میں کتنے سائنس دان اللہ کے سامنے سربسجدہ ہوتے، سائنس تو اپنے آپ کی پرستش کرتی ہے اپنے آپ کو سجدہ کرتی ہے جدید سائنس جو مادیت کی اساس سے نکلی ہے کبھی روحانیت کی سمت رہنمائی نہیں کرسکتی۔

ڈاکٹر صاحب کا اپنے آپ کو ہندو کہنا:

جناب ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب اپنی گفتگو بعنوان عالمی بھائی چارے کے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں سوال یہ ہے کہ

ذاکر بھائی! کیا اگر ایک ہندو قرآنی تعلیمات پر عمل کرتا ہے جو کہ ہندو فرمت کی کتب مقدسہ میں بھی موجود ہیں تو کیا وہ مسلمان کہلا سکتا ہے؟ اسی طرح اگر ایک مسلمان ہندو صحائف کی تعلیمات کو درست سمجھتا ہے تو کیا وہ ہندو کہلا سکتا ہے؟ کیوں کہ آپ کی گفتگو کا عنوان ہی ''عالمی بھائی چارہ'' ہے۔

جواب: بھائی نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے، یہ سوال بہت اچھا اس لئے ہے کیوں کہ یہ ایک واضح سوال ہے اگر آپ ایک واضح سوال پوچھیں گے تو میں اس کا جواب دے سکوں گا، سوال یہ ہے کہ ایک ہندو جو قرآنی تعلیمات اور ہندو مذہب پر

بیک وقت عمل کرتا ہے کیا وہ مسلمان کہلا سکتا ہے، اور یہ کہ کیا اس قسم کا مسلمان ھندو کہلا سکتا ہے؟ اس سلسلے میں پہلے تو ہمیں یہ پتہ ہونا چاہئے کہ ''ہندو'' اور ''مسلمان'' کی تعریف کیا ہے، یعنی ہندو کیسے کہتے ہیں اور مسلمان کیسے جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں ''مسلمان وہ شخص ہے جو اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دے، ہندو کی تعریف کیا ہے؟ کیا آپ جانتے ہیں؟ ''ہندو'' کی صرف ایک جغرافیائی تعریف ممکن ہے، کوئی بھی شخص جو ھندوستان میں رہتا ہے یا ہندوستانی تہذیب سے ادھر آباد ہے وہ ہندو کہلا سکتا ہے اس تعریف کی رو سے میں بھی ہندو ہوں، یعنی جغرافیائی اعتبار سے آپ مجھے ہندو کہہ سکتے ہیں۔ [خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک، ص: ۶۸ کتاب سرائے لاہور]

ڈاکٹر صاحب یہ نہیں سوچتے ہے کہ ھندوستان کی طرف منسوب شخص ہندو نہیں بلکہ ہندوستانی کہلائے گا، جس طرح امریکہ میں رہنے والا امریکی، برطانیہ میں رہنے والا برطانوی وغیرہ، اگر ہندوستان کے لفظ پر غور کریں تو عقدہ کھل جاتا ہے، ستان کا معنیٰ جگہ ہے قازقستانی، تاجکستانی، ازبکستانی، ترکستانی، تو ہندوستان کا معنیٰ ہوا ہندوؤں کی جگہ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ھندو کی وجہ سے یہ خطہ ہندوستان کے نام سے مرسوم ہے نہ کہ اس خطے کا نام ہندوستان ہونے کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو ہندو کہا جاتا ہے۔

نائیک صاحب اپنی تقریر بعنوان ''اسلام میں خواتین کے حقوق'' میں بیان کرتے ہے جو کہ کتاب خطبات ذاکر نائیک میں رسالے کے شکل میں موجود ہے۔

''ہماری آج کی گفتگو کا موضوع ہے: ''اسلام میں خواتین کے حقوق'' جدید یا فرسودہ؟ سب سے پہلے تو ہم اس موضوع کے بنیادی الفاظ کے معانی دیکھتے ہیں، اکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق حقوق نسواں (Women Rights) سے مراد وہ حقوق ہیں'' جو عورتوں کو وہی قانون اور سماجی مقام دلائیں، جو مردوں کو حاصل ہیں، (Modernize) کا مطلب اکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق ہے'' جدید بنانا، جدید مذاج وغیرہ کے مطابق ڈالنا اور دور حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا''۔

اور ویبسٹر ڈکشنری کے مطابق ''جدید بنانا یا ایک نئی شکل وصورت دینا مثال کے طور پر نظریات کو جدید شکل دینا مختصراً ہم کہ سکتے ہیں کہ جدت ایک ایسا عمل ہے جس میں تازہ ترین معلومات کی روشنی میں موجودہ صورتحال میں بہتری لانے کی کوشش کی جائے گی گویا موجودہ صورت حال بذات خود ''جدت'' نہیں کہلائے گا۔ [خطبات ذاکر نائیک ص:۱۳]

اسلام میں خواتین کے حقوق مندرجہ بالا گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام مرد اور عورت پر یکساں اخلاقی ذمہ داریاں عاید کرتا ہے اور ایک ہی جیسی قیود نافذ کرتا ہے سو آپ کے خیال میں اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے؟

''اسلام کے عطا کردہ حقوق نسواں جدید ہیں یا فرسودہ؟''

[کتاب ہذا،ص:۲۴]

نائیک صاحب اور جدّت پسندی:

یورپی صنعتی انقلاب کے بعد بہت سے متجددین نے اسلامی تعلیمات کو فرسودہ قرار دیکر اس کی جگہ نئی تعلیمات جو زمانے کی ضروریات کے مطابق ہو، ایک نئی فکر اور ایک نیا خیال پیش کیا، نائیک صاحب بھی ان متجددین میں سے ایک ہے اپنی تقریر میں پہلے کہتا ہے کہ ماڈرنائز (Modernize) کا مطلب ہے ''جدید بنانا'' اور دور حاضر کے تقاضوں سے ہم اہنگ کرنا اور بعد میں اسی معنیٰ کے تناظر میں اپنے مخاطبین سے سوال کرتے ہیں کہ اب آپ بتائیں کہ اسلام کے عطاء کردہ حقوق نسواں جدید ہیں یا فرسودہ؟

نائیک صاحب کے (Modernize) کا معنیٰ بیان کرنے کے بعد پھر خود اس اصطلاح کی تشریح کرنے کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ ہم اس بات کی تحقیق نہیں کریں گے کہ عہد حاضر میں قرآن وسنت کے اصل احکام کیا ہیں؟ بلکہ پہلے از خود معین کرلیں گے، کہ زمانے کی ضرورتیں کیا اور تقاضے کیا ہیں؟ پھر قرآن وسنت میں اس کے دلائل تلاش کریں گے اور اگر وہ نظر نہ آئے، تو قرآنی آیات اور احادیث کی ایسی تعبیر کریں گے کہ وہ ہماری معین کردہ ضروریات اور تقاضوں کے مطابق ہو اور زمانے کی

ضروریات کے بارے میں ہم نے جو نظریات قائم کررکھے ہیں، انہیں ثابت کرنے کے لئے قرآن وسنت سے دلائل تلاش کریں گے اور انہیں کھینچ تان کر اپنے نظریات پر فٹ بٹھانے کی کوشش کریں گے۔

حالانکہ یہی وہ چیز ہے جسے ''تحریف معنوی'' کہتے ہیں دنیا کا کوئی معقول پسند انسان نائیک صاحب اور دیگر اہل تجدد کے اس طرز فکر اور طرز استدلال کی تائید نہیں کرسکتا۔

نائیک صاحب اور ان جیسے دیگر تجدد پسند علماء کے بارے میں حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے تجدد پسند حضرات کو زمانہ صرف اس موقع پر بدلا نظر آتا ہے جب اس تبدیلی سے کوئی اباحت نکالنا یا مغرب کے کسی نظریئے کو اسلام کے مطابق ثابت کرنا پیش نظر ہو اور جہاں زمانے کی تبدیلی کا نتیجہ کسی مشقت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہو، وہاں زمانے کی تبدیلی کا کسی کو خیال بھی نہیں آتا اس کی واضح مثال یہ ہے کہ یہ بات تو اہل تجدد کی طرف سے بہت سنی گئی ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے اس لئے سود کو حلال ہونا چاہئے لیکن آج ہم نے کسی بھی تجدد پسند کی زبان سے یہ کبھی نہ سنا کہ زمانہ بدل گیا ہے اس لئے نماز میں قصر کی اجازت اب ختم ہو جانی چاہئے اور یہ اجازت اس وقت کے ساتھ مخصوص تھی جب سفر میں بے انتہا مشقت اٹھانی پڑتی تھی، لہذا جو لوگ ہوائی جہازوں اور ائیر کنڈیشنڈ کاروں میں سفر کرتے ہیں، ان کے لئے روزہ چھوڑنے اور نماز کو مختصر کرنے کی اجازت نہیں ہے، طرز عمل کے اس تفاوت سے آپ تجدذ کی اباحیت پسندانہ ذہنیت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ درحقیقت اس کی تمام تر دلیلیں اپنے پہلے سے قائم کئے ہوئے نظریات کے لئے باقاعدہ بنائی جاتی ہیں، پیش نظر چونکہ یہ ہے کہ مغرب کے نظریات کو اسلام میں داخل کیا جائے لہذا جس جگہ یہ مقصد پورا ہوتا ہے وہاں ہر گری پڑی بات

دلیل بن جاتی ہے اور جس جگہ وہی دلیل اپنے مقاصد کے خلاف پڑتی ہو وہ قابل التفات نہیں رہتی، کاش! کہ ہمارے تجدد پسند حضرات ان گزارشات پر سنجیدگی کے ساتھ اور حقیقت پسندی کے ساتھ غور فرماسکیں اوران کی فکری صلاحیتیں ''تحریف وترمیم'' کے بجائے کسی تعمیری خدمت میں صرف ہونے لگیں۔'' [اسلام اور جدت پسندی:ص:۲۶ مکتبہ دارالعلوم کراچی]

اسلام دین فطرت ہے:

اسلام دین فطرت ہے اور بلاشبہ اسلام کے بہت سے احکام ومسائل میں یہ لچک موجود ہے، کہ زمان ومکان کے تغیر حالات ونیّات کے اختلاف اورعرف وعادت کی تبدیلی سے ان مسائل کے احکام بدل جاتے ہیں، اور جولوگ اس حقیقت کونہیں جانتے وہ شریعت اسلامی کے بارے میں زبردست غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں، جن کی وجہ سے شریعت کے اندر تنگی، مشقت اور تکلیف مالا یطاق کی ایسی صورتیں فرض کرلی گئی ہیں، جن کے بارے میں صاف معلوم ہے کہ شریعت بیضاء جوانسانی مصالح کا پورا پورا لحاظ کرتی ہے ان روادارنہیں، کیونکہ شریعت سراسر مصلحت وحکمت ہے، اس لئے ہر وہ مسئلہ جوانصاف کے بجائے ظلم وزیادتی کا، سہولت کے بجائے لغویت کا، مصلحت کے بجائے مفسدت کا اور حکمت کے بجائے لغویت کا سبب بن جائے، تو وہ ہرگز شریعت کا مسئلہ نہیں ہوسکتا، خواہ تاویل وتوجیہہ کے ذریعے اسے نظام شریعت میں ٹھونس دیا جائے۔

لیکن اس تغیر وتبدل احکام کے کچھ اصول ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام کے ہرحکم کوتبدیل کیا جائے اور اجماعی فیصلوں کے خلاف خود احکام وضع کرکے انہیں ''اسلامی احکام'' قرار دیں۔ جونائیک صاحب اور ہمارے تجدد پسند حضرات اس زمانے کی تبدیلی کی آڑ میں نہ صرف اجماعی احکام کو بدلنا چاہتے ہیں جو چودہ سو سال سے مسلم آرہے ہیں، بلکہ وہ بہت سے عقائد میں بھی ایسی ترمیمات کرنا چاہتے ہیں جوقرآن وسنت کے واضح نصوص کے خلاف ہیں اور جنہیں آج تک امت کے کسی ایک قابل ذکر فرد نے بھی

تسلیم نہیں کیا۔

اسلام ایک جدیدیت پسند مذہب ہے یہ سوال جدیدیت کی درست تعریف کے تناظر میں درست سوال نہیں ہے:

نائیک صاحب کا تقریر کے دوران یہ سوال اٹھانا کہ اسلام کی تعلیمات میں جدت موجود ہے یا فرسودہ اور بعد میں مختلف دلائل سے اس میں جدّت تلاش کرنا صحیح نہیں، کیونکہ نائیک صاحب کے خیال میں اسلام ایک جدیدیت پسند مذہب ہے، لیکن یہ سوال جدیدیت کی درست تعریف کے تناظر میں درست نہیں ہے، جدیدیت کا بنیادی فلسفہ خارجی ذریعہ علم "External Source of knowledge" کے انکار پر قائم ہے، جدیدیت میں علم کا ماخذ نفس انسانی (Self) اور (Reason) ہے، لہذا انسان عقلیت دلیل، نفس پر ایمان لائے، انسان کسی دوسرے کی بندگی نہ کرے اپنی بندگی کرے اپنے نفس سے علم حاصل کرے جس کا طریقہ عقلیت (Rationality) یعنی دلیل (Reason) ہے، اسی سے عالمگیر قوانین اور آفاقی، اخلاقی تعلیمات معلوم کرے کانٹ اپنے مضمون (An Answer to the Question what is Enlightement) کہ جدیدیت کیا ہے میں کہتا ہے کہ انسان اب بالغ ہو چکا ہے اب اس کو خارجی ذریعہ علم کی ضرورت نہیں یہ اب خود اپنے نفس سے علم حاصل کرسکتا ہے۔

> Enilightement is man,s emergence from his self Imposed Immaturity. Immaturity is the inability to use one,s understanding with out guidance from another This immaturity is self imposed when it cause lies not in lack of understanding, but in lack of resolve and Courage to use it with guidance from another.

جبکہ اسلام اوراس کی تعلیمات جدیدیت کے منہاج علم میں اس لئے جدید نہیں ہوسکتیں کہ ان کا ماخذ وحی الٰہی اور ذات محبوب الٰہی یعنی External Authority ہے، اور خارجی ذریعہ علم کو ماخذ علم ماننے والا جدیدیت کی نظر میں انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں، وہ ماڈرن نہیں ہے وہ روشن خیال (Enlightand) نہیں ہے، وہ مہذب (Civilzed) نہیں ہے، وہ Human نہیں ہے اور ایسے لوگوں کو اس طرح مار دیا جائے جس طرح کیڑے مکوڑوں کو مارا جاتا ہے امریکہ میں دس کروڑ ریڈ انڈین (Red indian) اسی فلسفے کے تحت مارے گئے کہ وہ انسان کہلانے کے مستحق نہ تھے۔ مارکس کے فلسفے کے مطابق یہ لوگ (People without hisotry) تھے اس لئے ان کا قتل عام جائز تھا۔

لاک کے خیال میں:

> There is no difference between a buffalo and a native American.

کانٹ کے خیال میں:

> Blacks are not human they live in woods.

جدیدیت تاریخ کا بھی انکار کرتی ہے، کیونکہ ماضی، سابقہ تاریخ، سابق تہذیبیں، سابق تمدن، جو سترھویں صدی میں تحریک تنویر یا تحریک روشن خیالی سے پہلے دنیا میں وجود رکھتے تھے، وہ اندھیروں میں تھے، اندھیروں کی تخلیق تھے، دنیا میں اندھیروں کا سبب تھے، لہذا ان سب کو بھلا دینا، بھول جانا، ان سے رشتہ توڑ لینا، ان سے ترک تعلق کرنا ماڈرن ازم کا خاص وصف ہے اس لئے فوکالٹ کہتا ہے کہ انسان تو سترھویں صدی میں پیدا ہوا وہ اپنی کتاب (History of Sixuality) میں لکھتا ہے کہ انسان سترھویں صدی سے پہلے Sex کرنا بھی نہیں جانتا تھا، لہذا جدیدیت پوری تاریخ انسانی کا، تمام مذاہب کا، تمام تہذیبوں کا تمام روایات کا، تمام اقدار کا، تمام رویوں کا تمام ادیان کا انکار ہے، اسی لئے جدیدیت خود کو ایک نیا دور (Modren age) قرار دیتی

ہے اور سابقہ تمام ادوار تمام تہذیبوں کو قرون مظلمہ (Dark age) تاریک زمانہ روشنی سے محروم دور کہتی ہے، یہ دور، یہ تہذیب، یہ طرز زندگی، یہ تاریخ، یہ فلسفہ تاریخ کا سب سے اعلیٰ، افضل، بہتر، برتر شاندار دور ہے، اس سے اچھا، عمدہ، بہترین دور تاریخ میں نہ کبھی آیا نہ کبھی ائندہ آ سکتا ہے، جبکہ اسلام بہترین دور کا دوسرا تصور دیتا ہے کہ ''خیر القرونی قرنی'' یہ الفاظ جناب رسالت ماب ﷺ کے ہیں، اس لئے اسلام اور اس کی تعلیمات جدیدیت کی تعریف کی تناظر میں جدید نہیں ہوسکتیں، کیونکہ جدیدیت تاریخ انبیاء اور سابق ادوار کا انکار ہے سترہویں صدی کے بعد تاریخ اور تہذیب شروع ہو چکا ہے، لہذا نائیک صاحب کا اسلام کا جدیدیت پسند مذہب قرار دینا خود جدیدیت کی تعریف کے منافی ہے۔

اسلام میں عورت کے معاشی حقوق کے بارے میں نائیک صاحب کہتے ہیں، جہاں تک فیکٹریوں اور دیگر اداروں میں کام کرنے کا تعلق ہے، اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ ان اداروں کا انتظام اسلامی اصولوں کے مطابق چل رہا ہو۔

[خطبات ذاکر نائیک، ص:۲۶]

مرد عورت کا کفیل ہے:

نائیک صاحب کا یہ کہنا کہ اداکاری اور ماڈلنگ اور حسن و جمال نمایاں کرنے والے پیشوں کے سواء عورت کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرسکتی ہے، بغیر کسی قید وشرط، حاجت وضرورت شدیدہ کے نائیک صاحب کا یہ کہنا اسلام کی اس فطری تقسیم کے سراسر مخالف ہے جس میں اسلام نے مرد وزن کے دائرہ کار کو متعین کر کے معاشی جدو جہد اور اہل وعیال کی ذمہ داریوں کا بوجھ مرد پر ڈالا ہے، اور اسی اعتبار سے مرد ہی کو گھر اور خاندان کا منتظم اعلیٰ قرار دیا ہے۔

الرجال قوامون علی النساءِ بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض وبما انفقوا من اموالھم۔ [سورۃ نساء: ۳٤]

ترجمہ: ''مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کیے انہوں نے اپنے مال سے''۔

اور حدیث شریف کی تصریح کے مطابق عورت کا نفقہ ہر حال میں مرد پر فرض قرار دیا گیا ہے، حتی کہ عورت اپنا نفقہ نہ ملنے کی صورت میں مرد سے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

تقول المرأة امّاان تطعمنى امّا ان تطلقنى.

[الصحیح البخاری کتاب النفقات، ۸۰۶/۲]

ترجمہ: ''عورت کہتی ہے کہ یا تو تم مجھے کھانا دو یا طلاق دو''

بعض دیگر احادیث سے معلوم ہوا ہے کہ شوہر جب بیوی بچوں پر حسب ضرورت خرچ نہ کرتا ہو یا بخل سے کام لیتا ہو، یا وہ غائب رہتا ہو، تو بیوی کو اختیار ہے کہ وہ شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر حسب ضرورت اپنا خرچ لے سکتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کی بیوی ھندہ بنت عتبہ کی شکایت پر اجازت دیتے ہوئے فرمایا۔

قال اخبرنی عروۃ ان عائشة قالت جاء ت ھندیه بنت عتبة فقالت یارسول اللّٰه ان ابا سفیٰن رجلٌ مسیك فهل عَلیَّ حرجٌ ان اطعم من الذی له عیالنا فقال لا الا بالمعروف. [الصحیح البخاری. ۸۰۷/۲]

دوسری حدیث میں ہے:

عن عائشه ان هندَابنت عتبة قالت یارسول اللّٰه ان اباسفین رجلٌ شحیحٌ ولَیس یعطنی مایکفینی وولدی الاما اخذت منه وهو لایعلم فقال خذی مایکفیك وولدك بالمعروف. [الصحیح البخاری. ۸۰۸/۲]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ھندہ بنت عتبہ نے کہا یارسول اللہ ابوسفیان ایک بخیل آدمی ہے، اور وہ مجھے اتنا خرچ نہیں دیتا کہ میرے لئے اور میرے بچوں کے لئے کافی ہو جائے مگر یہ کہ میں اس سے لے لو اور اس کو علم نہ ہو آپ ﷺ نے فرمایا۔

اپنے شوہر کے مال سے معروف طور پر اتنا لے لو جو تمہارے اور تمہارے بچوں کے لئے کافی ہو جائے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اسلامی تمدن و معاشرت کے نہایت اہم اصول بیان کئے گئے ہیں، اس میں بھی آپ نے نہایت صراحت کے ساتھ فرمایا۔

الا وحقهن عليكم ان تحسنوا اليهن في كسوتهن وطعامهن

ترجمہ: ''ہاں دیکھو ان عورتوں کا تم پر حق ہے کہ تم ان سے ان کے کھانے کپڑے میں اچھا برتاؤ کرو۔''

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ اسلامی شریعت کی رو سے معاشی جدوجہد کی ذمہ داری اصلاً مرد پر ڈالی گئی ہے اور وہی اپنے بال بچوں کا کفیل ہے اور جدید عائلی قوانین میں بھی عورت کا نفقہ مرد ہی کے ذمہ واجب قرار دیا گیا ہے حتی کہ موجودہ سیکولر عدالتوں کے ذریعہ بھی مطلقہ عورت تک کو جب تک وہ دوسری شادی نہ کرے مرد ہی سے نان ونفقہ دلایا جاتا ہے۔

نائیک صاحب نے بغیر ضرورت اور حاجت کے عورتوں کو فیکٹریوں اور دیگر اداروں میں کام کرنے کی اجازت دی ہے، حالانکہ فقہاء کرام بغیر ضرورت شدیدہ کے عورت کو ملازمت کی اجازت نہیں دیتی ہے اور ضرورت کیا ہے۔

فالضرورة بلوغة حدًا ان لم يتناول الممنوع هلك اوقاربه. [الاشباه والنظائر للسيوطي ص ۱۷۷]

''ضرورت'' آدمی کا اس حد کو پہنچ جانا ہے کہ اگر ممنوعہ چیز نہ کھائے، تو ہلاک ہو جائے یا ہلاک ہونے کی قریب ہو جائے۔

فالضرورة مايترتب على عصيانها خطرٌ كمافي الاكراه الملجئ وخشية الهلاك جوعاً. [المدخل الفقهي العام]

ضرورت وہ ہے جس کو نظر انداز کرنے پر خطرہ (ہلاکت) درپیش ہو جیسا کہ اکراہ ملجی میں ہوتا ہے اور بھوک کی وجہ سے جان جانے کا اندیشہ، اس کے علاوہ عورت کو فیکٹریوں

اور دیگر اداروں میں کام کرنے کی مکمل آزادی دینا آیت'' **وقرن فی بیوتکن** '' کی بھی سراسر خلاف ہے۔

'' یعنی تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو، اس میں صرف اتنی بات نہیں کہ عورت کو ضرورت کے بغیر گھر سے باہر نہیں جانا چاہئے بلکہ اس آیت میں ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے وہ یہ کہ ہم نے عورت کو اس کے لئے پیدا کیا ہے کہ وہ گھر میں قرار سے رہ کر گھر کے انتظام کو سنبھالے۔

ایک فرانسیسی ایڈوکیٹ کرسٹین کی رپورٹ:

ایک فرانسیسی ایڈوکیٹ کرسٹین اس وقت اس حقیقت کی تہہ تک پہنچی، جب اس نے مشرق کے مسلم ممالک کا دورہ کیا وہ لکھتی ہے۔

> میں اپنے سات ہفتوں کے دورے میں بیروت، دمشق، عمان اور بغداد گئی اور آج میں پیرس واپس آ گئی ہو......تو میں نے کیا پایا؟ میں نے ایک مرد کو دیکھا، جو صبح صبح اپنے کام پر جاتا ہے، تھکتا ہے محنت کرتا ہے، پھر شام ڈھلے اپنے گھر واپس لوٹتا ہے، تو اس کے ہاتھ میں روٹی ہوتی ہے اور اس روٹی کے ساتھ ساتھ بے پناہ محبت اور شفقت ہوتی ہے، اپنی بیوی بچوں کے لئے، ان ممالک میں عورت کا اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں، کہ وہ ایک نسل کی تربیت کرے اور اس مرد کا خیال رکھے جس کو وہ چاہتی ہے یا کم از کم وہ مرد اس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔
>
> مشرق میں عورت سوتی ہے اور خواب دیکھتی ہے پھر جو چاہتی ہے حاصل کر لیتی ہے کیونکہ اس کا مرد اس کے لئے، روٹی، محبت، سکون اور آسائش مہیا کرتا ہے، جبکہ ہمارے یہاں عورت نے مرد کی برابری حاصل کرنے کئے باقاعدہ جنگ لڑی ہے کیا ہاتھ آیا اس عورت کے؟
>
> ذرا مغربی یورپ کی عورت پر ایک نظر ڈالیں وہ آپ کو بکاؤ مال سے زیادہ

وہ نظر نہیں آئے گی، جس سے مرد کہتا ہے اٹھو اپنی روٹی خود کماؤ کیونکہ تم نے ہی برابری حاصل کرنے کی خواہش کی تھی، اور اسی طرح محنت اور مشقت اور تھکن کے ساتھ ساتھ عورت اپنی نسوانیت کھو بیٹھتی ہے اور مرد اپنی شریک زندگی کو بھول جاتا ہے رہ جاتی ہے تو صرف ایک بے معنی اور بے مقصد زندگی۔ [ایک مومنہ کے لئے: ص ۸۶، ۸۷]

عورتوں کی فیکٹریوں میں کام کرنے سے فیملی سسٹم تباہ ہو جائے گا:

نائیک صاحب کا یہ کہنا کہ اسلام میں عورتوں کو فیکٹریوں میں کام کرنے کی اجازت ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں، اس نوکری کے نتیجے میں تو فیکٹریاں اور دیگر ادارے تو ان عورتوں کے ذریعے آباد ہو جاتے ہیں، لیکن جب باپ بھی باہر، ماں بھی، باھر اور بچے اسکول یا نرسری میں اور گھر پر تالا پڑ جائے گا، اور سارا فیملی سسٹم تباہ ہو جائے گا، تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ عورت کو تو اس لئے بنایا تھا کہ جب وہ گھر میں رہے گی تو گھر کا انتظام بھی کرے گی اور بچے اس کی گود میں تربیت پائیں گے ماں کی گود بچے کی سب سے پہلی تربیت گاہ ہوتی ہے، وہیں سے وہ اخلاق سیکھتے ہیں، وہیں سے وہ کردار سیکھتے ہیں، وہیں سے زندگی گزارنے کے صحیح طریقے سیکھتے ہیں، اس کے علاوہ ایک ماں کا اپنے بچوں سے گھنٹوں دور رہنا اور ان کے بارے میں فکر مند رہنا بھی عورت کے لئے کسی قید سے کم نہیں اس کے علاوہ گھر سے آفس اور آفس سے گھر آنے جانے میں جو مشکلات آتی ہے وہ الگ ہیں۔

بچے کو ماں کی ممتا کی ضرورت ہے:

باوجود یہ کہ بچہ ماں باپ دونوں کا ہوتا ہے، لیکن جتنا پیار اور جتنی ممتا اللہ تعالیٰ نے ماں کے دل میں رکھی ہے باپ کے دل میں اتنی نہیں رکھی اور بچے کو جتنا پیار اپنی ماں سے ہوتا ہے اپنے باپ سے اتنا نہیں ہوتا اور جب بچے کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو چاہے کسی بھی جگہ ہو وہ فوراً اماں کو پکارے گا باپ کو نہیں پکارے گا، لیکن نائیک صاحب کی تعلیمات کی

روشنی میں اگر عورت فیکٹریوں اور دیگر اداروں میں ملازمت کرے گی، تو پھر دیگر ادارے تو آباد ہوں گے لیکن گھر اجڑ جائیں گے، بچے ماں کے ممتا سے محروم رہیں گے۔

(Heymann) ہاوڑ د یونیورسٹی کے ریسرچ پروجیکٹ نگران کے مطابق اس نے جن خاندانوں سے انٹرویو لیا ان میں سے ۳۶ فیصد خاندانوں نے اعتراف کیا کہ وہ اپنے چھوٹے بچوں کو گھر میں اکیلئے چھوڑتے ہیں۔ ۳۹ فیصد کا کہنا تھا کہ وہ اپنے بیمار بچوں کو گھر پر چھوڑ دیتے ہیں جب کہ ۲۷ فیصد کا کہنا تھا کہ وہ دوسرے بچوں کی نگرانی میں چھوٹے بچوں کو چھوڑتے ہیں۔

والدین نے محققین کو بتایا کہ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے چھوٹے بچوں کو اٹھ سالہ بچے کی نگرانی میں چھوڑ دیں۔ بعض اوقات خطرے سے بچانے کے لئے وہ بچوں کو تالے میں بند کر کے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود بچوں کی حفاظت کا مسئلہ اہم ترین ہے۔

A young mother working in a free trade zone in Asia or central America rarely has her mother nearby to help out, and she can,t take her child to a factory. The problems she faces deeply familiar to women in the developed world-finding reliable childcare,coping when the child is sick or has school holidays-but the picture of how she copes (and the burden of coping does fall disproportionately on women) is dramatically more stark, according to Heymann,s Harvard research project. Places at workplace nurseries are often limited or nonexistent, and employment rights, such as decent

maternity leave or leave or a family emergency, are restricted.Heymann found that of the families lhey interviewed 36 per cent admitted they had had to leave young children at home alone,39 per cent had left a sick child at home alone and 27 per cent had left a child in the care of another child.

Parents described in interviews with researchers how they had no choice but to leave eight years olds in charge of their toddler siblings, sometimes locking them into the home to try to ensure their safety. But safety is one of the biggest problems in half of of the families interviewed in Botswana and Mexico. children had suffered accidents while their parents were at work. [ساحل صفر ۱۴۲۷ھ،ص ۶۳۔۵۴]

دولت کمانے کا مقصد کیا ہے؟:

قرآن کریم میں جو آیت ”وقرن فی بیوتکن“ ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا کہ ہم نے عورت کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ زندگی کا یہ اہم ترین خدمت انجام دے کر اپنے فیملی سسٹم کو استوار کرے، اور اپنے گھر کو سنبھالے، اس کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں کہ گھر کا گھر اجڑ پڑا ہے، اور ساری توجہ باہر کے کاموں میں صرف ہو رہی ہے باہر رہ کر انسان جو کچھ کماتا ہے کہ گھر کے اندر سکون حاصل کرے لیکن اگر گھر کا سکون تباہ ہے تو پھر اس نے جتنی کمائی کی ہے وہ کمائی بیکار ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں، لیکن نائیک صاحب یہ نہیں دیکھتے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا، صرف وہ مغرب کی اندھی تقلید کرنے پر تلے

ہوئے ہیں اور جزئیات سے کلیات کی اخذ کرنے کی بے جا کوشش کررہے ہیں، خود نائیک صاحب فرماتے ہیں کہ عورت کو جائیداد میں ادھا حصہ اس لئے ملتا ہے کہ اس پر معاش کی ذمہ داری نہیں، جب ذمہ داری نہیں تو پھر عورت کو کاروبار کی اجازت عام کس اسلامی قانون کے تحت دی جارہی ہے، نائیک صاحب خود ہی اپنے موقف کی تردید کررہے ہیں، لہذا نائیک صاحب کا اسلامی تاریخ میں چند استثنائی واقعات کی بنیاد پر عورت کو کھلے عام فیکٹریوں میں کام کرنے کی اجازت دینا صحیح طریقہ نہیں ہے بلکہ مغرب کی نقالی ہے۔

مرد کو عورت پر فضیلت:

نائیک صاحب عورتوں کی معاشرتی حقوق کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

سورۃ بقرۃ میں ارشاد بارتعالیٰ ہے:

﴿ ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف وللرجال علهین درجة واللّٰه عزیز حکیمٌ. [البقرة ۲۲۸]

یہاں میں جسٹس ایم ایم قاضی سے پورا اتفاق کرتا ہوں، یہ بات بالکل درست ہے کہ بیشتر مسلمان اس آیت کا مفہوم غلط اخذ کرتے ہیں، خصوصاً مرد کو ایک درجہ حاصل ہونے کی بات کو بالعموم غلط سمجھا گیا، حالانکہ جس طرح کہ میں نے پہلے عرض کیا کسی بھی حکم کو سمجھنے کے لئے پورے قرآن میں متعلقہ بیانات کو سامنے رکھنا ضروری ہے، سورۃ نساء میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ [النساء: ۳۴]

ترجمہ: ''مرد، عورتوں پر قوام ہیں''۔

لوگ بالعموم ''قوام'' کا ترجمہ ''ایک درجہ بڑھ کر تے ہیں یا یہ کہ مرد ایک درجہ افضل ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قوام کا لفظ اقامۃ سے نکلا ہے، مثال کے طور پر نماز سے پہلے اقامت ہوتی ہے جس کا مطلب ہوتا ہے، نماز کے لئے کھڑے ہوجاؤ، گویا اقامۃ کے

معنیٰ ہوئے کھڑے ہو جانا، اور جہاں تک قوام کے معنیٰ کا تعلق ہے تو اس لفظ کے معنی یہ نہیں ہے کہ مرد کو عورت پر ایک درجہ برتری فضیلت حاصل ہے، بلکہ یہ ہے کہ مرد کی ذمہ داریاں ایک درجہ زیادہ ہیں۔ [خطبات ذاکر نائیک، عورتوں کی معاشرتی حقوق، ص: ۳۸]

ڈاکٹر صاحب کی کم علمی اور جہالت کا یہ حال ہے کہ لفظ ''قوام'' کا مادہ اقامۃ بتا رہے ہیں جبکہ یہ قوامہ سے نکلا ہے۔

قوامون کا ترجمہ مفسرین نے حاکم، سرپرست سے کیا ہے یعنی مرد حاکم ہیں عورتوں پر یعنی جس طرح ملکی، سلطنتی اور ریاستی نظام میں کسی سربراہ یا امیر یا حاکم کا ہونا ضروری ہے اسی طرح عائلی نظام جس کو خانہ داری کہا جاتا ہے اس میں بھی ایک سربراہ یا حاکم کی ضرورت ہے تو گھر کے عورتوں اور بچوں کے مقابلے میں اس کام کے لئے حق تعالیٰ نے مردوں کو منتخب فرمایا اور اس کی دو وجہ بھی ارشاد فرمائی گئیں۔

(۱) بمافَضَّلَ اللّٰه بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ.

(۲) وَبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ.

مردوں کی عورتوں پر حاکمیت کی ایک قدرتی وجہ تو مردوں کی خداداد فضیلت اور دوسری کس وجہ کہ مرد اپنا مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، ان کے مہر ادا کرتے ہیں اور ان کے نان ونفقہ اور ضروریات زندگی کی ذمہ داریاں اٹھاتے ہیں، ان دو وجہوں سے مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا گیا۔

پہلی وجہ یعنی مردوں کی قدرتی اور خداداد فضیلت شریعت میں بالکل ظاہر و باہر ہے حق تعالیٰ نے بہ نسبت عورتوں کے مردوں کو عقل، علم، فہم، حسن تدبیر، قوت نظریہ، قوت عملیہ اور قوت جسمانیہ وغیرہ کہیں زائد عطاء کی ہے، اور نبوت و امامت، خلافت اور وجوب، جہاد، جمعہ وعیدین، اذان وخطبہ اور جماعت مردوں کے ساتھ خاص ہے اس طرح میراث میں حصہ کی زیادتی اور تعدد ازواج اور طلاق کا اختیار اور بلا نقصان کے نماز روزہ کا پورا کرنا اور حیض ونفاس اور ولادت اولاد سے محفوظ رہنا یہ سب فضائل حق تعالیٰ نے مردوں ہی کو عنایت کئے ہیں ان ہی فضائل اور خصوصیات کی بناء پر نبی اکرم ﷺ نے

ارشاد فرمایا کہ اگر میں کسی کے لئے حکم دیتا کہ وہ کسی کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، جسمانی قوت میں بھی عورتیں مردوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، اور ظاہر ہے کہ کمزور اور ناتواں کو قوی اور توانا پر نہ حکومت کا حق ہے، اور نہ وہ کرسکتا ہے، اس کے علاوہ جنگ وجدال، شجاعت وبہادری اور میدان جنگ میں حکومت وسلطنت کے لئے جانبازی اور سرحدوں کی حفاظت ونگرانی یہ سب کام مرد ہی سرانجام دیتے ہیں، اور عورت کی فطری نزاکت، حمل اور ولادت اس کی کمزوری کی کھلی دلیل ہے، غرض یہ کہ حق تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فوقیت اور فضیلت ایک تو قدرتی عطا فرمائی دوسری فوقیت اور فضیلت کبی ہے کہ مردوں نے عورتوں پر اپنے مالوں میں سے بہت کچھ خرچ کیا کہ عورتوں کا مہر دیا ان کا نفقہ اور خرچ اپنے ذمہ لیا، تو مرد عورتوں کے محسن ہوئے اور محسن کو حکومت کا حق ہے، اس وجہ سے بھی قدرت نے عورتوں کو مردوں کا تابع اور محکوم بنایا۔

علامہ الوسی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر روح المعانی میں اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ ای شانهم القيام عليهن قيام الولاة على الرعية بالامر والنهي ونحو ذلك...... ولذاخصوابالرسٰلة والنبوة على الاشهروبالا مامة الكبرىٰ والصغرىٰ و اقامة الشعائر كالاذان والاقامة والخطبة والجمعة وتكبيرات التشريق عندامامنا الاعظم.

[روح المعانی ۵/۲۳]

علامہ الوسی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر مفسرین حضرات اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مرد کو عورت پر اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے فضیلت، سرپرستی اور حاکمیت حاصل ہے، لیکن نائیک صاحب جو کہ عربی سے بھی ناواقف ہے، اس بات کا انکار کرتے ہیں اور مفسرین کے طرف غلطی کا اشارہ کرتے ہیں کہ مفسرین نے غلط معنیٰ کیا ہے، جن مفسرین نے علم کے لئے ساری زندگی وقف کررکھی تھی وہ اس کا معنیٰ غلط کررہے ہیں، جبکہ نائیک

صاحب M.B.B.S کی ڈگری حاصل کر کے قرآن کا معنی صحیح بتا رہے ہیں۔

قرآن میں بیعت کی آیت اور نائیک صاحب کی تفسیر بالرائے:

نائیک صاحب ''بعنوان'' ''اسلام میں عورت کے سیاسی حقوق'' کی تقریر میں بیان کرتے ہیں، جو کہ خطبات ذاکر نائیک نامی کتاب میں صفحہ ۶۹ پر مذکور ہے۔

مرد اور عورت محض سماجی سطح پر ہی نہیں بلکہ سیاسی سطح پر بھی ایک دوسرے کے لئے مد ومعاون ہیں اسلام عورت کو سیاسی معاملات میں اپنی رائے کا اظہار کرنے کا حق بھی دیتا ہے، سورۃ ممتحنہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَى أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ [الممتحنہ:۱۲]

یہاں بیعت کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بیعت کے لفظ میں آج کل کے الیکشن کا مفہوم بھی شامل ہے، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول بھی تھے اور سربراہ مملکت بھی اور بیعت سے مراد انہیں سربراہ حکومت تسلیم کرنا تھا، اس طرح اسلام نے اسی دور میں عورت کو ووٹ دینے کا حق بھی تفویض کر دیا تھا۔

[خطبات ذاکر نائیک: بعنوان اسلام میں عورت کے سیاسی حقوق، ص:۴۹۔۵۰]

اس پوری آیت میں بیعت سے مراد الیکشن، جمہوریت، جمہوری عمل، ووٹ، رسول اللہ کی بحیثیت حکومت عہدے کی تصدیق وتائید وتصویب کا کوئی شائبہ تک نہیں، بلکہ یہاں مومنات صحابیات کی بیعت اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، زنا چوری نہ کریں گی، اولاد قتل نہ کریں گی کسی پر بہتان نہ باندھیں گی اور مشروع باتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہ کریں گی، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ اگر عورتیں

ان چھ باتوں پر عہد کرلیں اوراس پر بیعت کریں، تو آپ ان کی بیعت قبول کرلیں اور ان کے پہلے گناہوں پر اللہ تعالیٰ سے مغفرت ان کے لئے طلب کریں، اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

نائیک صاحب کا یہ کہنا درست نہیں کہ ان عورتوں کا حضور ﷺ کے پاس آ کر بیعت کرنا موجودہ جمہوریت کے طرز انتخاب کی ہی قدیم شکل ہے، کیونکہ موجودہ جمہوریت کے مطابق سب کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ سربراہ چننے کے لئے اپنے رائے دیں اور اگر کسی شخص پر اتفاق رائے نہ ہو تو وہ سربراہ نہ بن سکے گا اگر رسول اللہ ﷺ کو درحقیقت ووٹ لینا تھا تو کیا ان صحابیات کو اختیار تھا کہ وہ حضور ﷺ کی سربراہی تسلیم نہ کرتیں؟ اور اگر یہ بیعت ووٹ کاسٹنگ تھی، تو حضور ﷺ نے مدینہ کے تمام مردوں اور عورتوں سے ووٹ کیوں نہ لئے؟ حضور ﷺ کی وفات کے بعد سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لئے یہ طریقہ کیوں نہ اپنایا؟ نائیک صاحب کا الیکشن اور جمہوریت کو اس آیت کریمہ کا مدلول بنانا تحریف معنوی اور تفسیر بالرائے کے زمرے میں آتی ہے، لیکن نائیک صاحب بغیر کسی خوف کے نہ صرف اس آیت کی بلکہ متعدد آیات کی تشریح وتفسیر اپنی رائے کے ساتھ کرتے ہیں، جس کی وضاحت انشاء اللہ ائندہ صفحات میں آئیگی، لیکن یہاں کچھ تفسیر بالرائے کے حوالے سے کچھ ذکر کروں گا، کہ تفسیر بالرائے کیا ہے۔

تفسیر بالرائے اور احادیث:

(۱) عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبؤ مقعده من النار هذا حديث حسنٌ صحيح. [جامع الترمذی ۲/۱۲۳]

ترجمہ: ''ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس آدمی نے قرآن میں بغیر علم کے کچھ کہہ دیا، پس اس کو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنادے۔''

(۲) عن ابن عباس ﷺعن النبی ﷺقال اتقو الحدیث عنی الاماعلمتم فمن کذب علیَّ متعمدًا فلیتبو امقعدہ من النار ومن قال فی القرآن برائیہ فلیتبواء مقعدہ من النار ھذا حدیث حسن. [جامع الترمذی۲/۱۲۳]

ترجمہ:''ابن عباس رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ میری طرف سے حدیثیں گھڑنے سے بچو مگر وہ جس کا تمہیں علم ہو، جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا پس اس کو چاہیئے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے، اور جس نے قرآن میں اپنے رائے سے کچھ کہا، اس کو چاہیئے کہ وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنادے۔

(۳) عن جندب بن عبد اللّٰہ قال قال رسول اللّٰہ ﷺمن قال فی القرآن برائیہ فاصاب فقداخطاء. [جامع الترمذی،۲/۱۲۳]

ترجمہ:'' جندب بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا تو اگر وہ رائے صحت کو پہنچی لیکن پھر بھی اس نے خطاء کی۔''

تفسیر بالرائے کے بارے میں علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے:

تفسیر بالرائے کے معنیٰ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان کئے ہیں کہ کسی شخص کا کسی چیز کی طرف طبعی میلان اور رغبت ہو اور قرآن کی آیات کی اس طرح تفسیر کرے کہ اس کی خواہش اور رغبت کے مطابق آیات کے معنیٰ اور تشریح ہو جائے تا کہ وہ اپنے میلان اور رغبت کو قرآن سے ثابت کر سکے۔

ان یکون لہ فی الشئ رای والیہ میلٌ من طبعہ وھواہ فیتأول القرآن علیٰ وفق رایہ وھواہ لیحتج علی تصحیح عرضہ ولم یکن لہ ذالک الرأی والھوی لکان لایلوح لہ من القرآن ذلک المعنیٰ وھذا النوع یکون تارۃ مع العلم

كالذى يحتج ببعض آيات القرآن على تصحيح بدعته وهو يعلم ان ليس المراد بالاية ذلك ولكن مقصوده ان يلبسَ على خصمه، وتارة يكون مع الجهل، وذالك اذا كانت الاية محتملة فيميل فهمه الى الوجه الذى يوافق غرضه ويرجح ذالك الجانب برأيه وهواه، فيكون قد فسر برأيه......الخ. [الجامع كاحكام القرآن ۱/۳۳]

تفسیر بالرائے کی ایک اور تعریف بھی بیان کی گئی ہے کہ قرآنی آیات کا مطلب اپنی رائے، سوچ اور خیال سے اس طرح بیان کرنا کہ وہ عربی قواعد یا شرعی اصولوں اور دین کے تسلیم شدہ حقائق کے خلاف ہو، یہ تفسیر بالرائے ہے، تفسیر بالرائے کو معنوی تحریف بھی کہا جاتا ہے۔

علامہ نظام الدین نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر غرائب القرآن میں تفسیر بالرائے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دیانت اور تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں ہرگز ایسی کوئی تاویل نہ کی جائے، جس سے وہ حقائق باطل یا مردود قرار پاتے ہوں، جن کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنی تفسیر وتشریح میں بیان کیا ہو، جیسے معاد، حشر ونشر، جنت ودوزخ، میزان، صراط، حور، جنت کی نہریں اور اشجار وغیرہ یہی وجہ ہے کہ اہل علم نے تفسیر بالرائے کو قابل مذمت اور حرام قرار دیا ہے۔

مفسِّر کی شرائط:

نائیک صاحب آیات کی غلط سلط تشریح کر کے کبھی ان آیات سے سائنس ثابت ثابت کرتے ہیں، تو کبھی جمہوریت، کبھی اپنی تقریروں میں کہتے ہیں کہ قرآن سمجھنا اور سمجھنا صرف علماء کا کام نہیں، ہر کوئی قرآن کو سمجھ اور دوسروں کو سمجھا سکتا ہے بلکہ وہ یہاں تک کہنے میں عار محسوس نہیں کرتے ہیں کہ اگر کوئی سائنسی آیت ہو، تو پھر اس کی تفسیر کسی سائنس دان سے پوچھنا چاہئے، حالانکہ نائیک صاحب کو یہ پتہ نہیں کہ مفسر کے لئے کون

سے شرائط کا ہونا ضروری ہے۔

مفسر کی شرائط میں سب سے پہلی شرط اس کا صحیح العقیدہ ہونا ہے، کیونکہ جس شخص کا عقیدہ ہی درست نہیں، وہ قرآن کریم کی صحیح تفسیر نہیں کرسکتا، بلکہ وہ اپنے باطل عقیدہ اور نظریہ کو قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش میں قرآن کے معانی اور مفاہیم کو بگاڑ کر پیش کرے گا، اور یوں تفسیر میں خیانت کا مرتکب ہوگا۔

دوسری شرط اس کا عالم ہونا ہے، امام جلال الدین سوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الاتقان میں مفسر کے لئے ۱۵ علوم میں ماہر ہونا لازمی قرار دیا ہے۔

(۱) لغات عرب (۲) علم نحو (۳) علم صرف (۴) علم معانی
(۵) علم اشتقاق (۶) علم بیان (۷) علم بدیع (۸) علم قرأت
(۹) علم اصول الدین (۱۰) علم اصول فقہ (۱۱) اسباب نزول (۱۲) علم ناسخ ومنسوخ
(۱۳) علم فقہ (۱۴) علم الحدیث (۱۵) علم وہبی ☆☆☆

[الاتقان فی علوم القرآن اردو، ص: ۵۷۴،۵۷۳،۵۷۲]

نائیک صاحب جو کہ ایک M.B.B.S ڈاکٹر ہے، اور تھوڑا بہت تقابل ادیان کا علم رکھتا ہے کیا وہ ان شرائط پر پورا اترتا ہے؟ یقیناً وہ ان تمام علوم سے عاری ہے، لیکن وہ اس لاعلمیت اور عاریت کے ساتھ ساتھ نہ صرف وہ خود قرآن کی آیات کے نت نئی تعبیرات پیش کرتا ہے بلکہ ساتھ ساتھ عام لوگوں کے لئے بھی اس کو آسان کام بتاتا ہے کہ قرآن کا سمجھنا صرف علماء کا کام نہیں، کیا قرآن وسنت کی تشریح وتعبیر کے لئے کوئی اہلیت اور قابلیت درکار نہیں؟ کیا اس کے لئے کسی درس گاہ میں پڑھنے اور کسی استاد سے علم حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں؟ کیا پوری دنیا میں ایک قرآن وسنت ہی کا علم ایسا لاوارث رہ گیا ہے؟ کہ اس کے معاملے میں ہر شخص کو اپنی ''تشریح وتعبیر'' کرنے کا حق حاصل ہے، خواہ اس نے قرآن وسنت کا علم حاصل کرنے کے لئے چند مہینے بھی خرچ نہ کئے ہوں۔

نائیک صاحب! آپ کے مفسر بننے کا شوق بلاشبہ قابل تعریف ہے لیکن یہ شوق

صرف M.B.B.S ڈگری حاصل ہونے اور سرسری مطالعے سے ہرگز پوری نہ ہوگی، اس کے لئے جس دیدہ ریزی کی ضرورت ہے پہلے کچھ اس کا ذائقہ تو چکھئے، زندگی کا کچھ حصہ کتاب وسنت کے کوچے میں گزاریئے اس کوچے کے آداب سیکھیئے، اس کے بعد اگر کوئی شخص آپ کے لئے کتاب وسنت کی تشریح کے حق کا قائل نہ ہو تو بلاشبہ آپ کا گلہ جائز اور برحق ہوگا۔

سورۃ شوریٰ کی آیت، نائیک صاحب اور جمہوریت:

نائیک صاحب سورۃ شوریٰ کی آیت ''والذین استجابو لربھم واقامو الصلوۃ وامرھم شوریٰ بینھم ومما رزقنھم ینفقون ''(شوریٰ ۳۸) سے استدلال کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہے، اور قرآن میں جمہوریت کا ذکر آیا ہے جس مغربی جمہوریت کو نائیک صاحب قرآن سے ثابت کررہے ہیں، اس جمہوریت اور جمہوری عمل کو اسلام سے کیا تعلق؟ جمہوریت کی حقیقت کیا ہے؟ جمہوری نظام کیا ہے؟ اور اس نظام کے نقائص کیا ہے؟ اور اس جمہوری عمل کا قرآن اور اسلام سے کیا تعلق ہے؟ آیئے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

لفظ جمہوریت کی لغوی تحقیق:

عربی لغت کے ماہرین کی اراء سے واضح ہوتا ہے کہ جمہوریت کا ماخذ لفظ ''جمہور'' ہے، جس کا بنیادی مادہ جمہر (ج،م،ہ،ر) بتایا گیا ہے، لسان العرب میں ہے۔

جمهرت القوم اذا جمعتهم...... جمعهرت الشئ اذاجمعته. [لسان العرب ٤/١٦٩]

وجمهره جمعة والقبر جمع عليه التراب ولم يطينه.

[القاموس ۱/۳۹۳]

مرتضیٰ زبیدی کے بقول وجمهر، ای الشی جمعه (تاج العروس ۱۰/۲۱۵)

گویا جمھر کا بنیادی معنیٰ ہوا، کسی چیز کا جمع ہونا یا اکثریت میں ہونا اسی سے لفظ جمہور

ترکیب پاتا ہے۔ ''والجمهور من الناس: جلهم واشرافهم ، وهذا قول الجمهور ۔ (تاج العروس ۱۰/۲۱۵) لفظ جمہور کے آخر میں حرف ''ۃ'' کا اضافہ ہو تو اس کا مطلب مرتضٰی زبیدی کے بقول ''المرأة الكريمية '' بنتا ہے۔

اسی طرح اس لفظ کے آخر میں یائے نسبتی کے اضافے سے اس کا معنیٰ ''المنسوب الیٰ الجمهور '' کے ہو جاتے ہیں یعنی اکثریت کی چیز کو جمہوری کہا جائے گا، عربی میں ''جمہوری'' ایک شراب کا نام بھی ہے۔

مندرجہ بالا بحث کا نتیجہ نکلتا ہے کہ ''جمہور'' کا بنیادی معنیٰ اکثریت یا کثرت اور نمایاں یا بلند تر ہے، اور انسانوں کے حوالے سے جب یہ لفظ استعمال ہو تو اس سے مراد عوام الناس یا ان کے معززین کی اکثریت ہوتی ہے، اسی مفہوم کے پیش نظر کتب اسلامی میں ''جمہور'' کا لفظ کثرت سے استعمال ہوتا ہے، جس سے مراد معتبر علماء کی ''اکثریت'' ہوتی ہے درج بالا تجزیئے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایسی کوئی بھی چیز جو اکثریت سے منسوب ہو جمہوری کہلاتی ہے اور اسی لفظ سے جمہوریت ترکیب پایا ہے، گویا اسی بنیاد پر اکثریت کی مرضی کی حکومت و ریاست جمہوریت کہلاتی ہے، اور یہ اصطلاحی عربی زبان سے اردو زبان میں استعمال ہونا شروع ہوئی ہے۔

اصطلاحی مفہوم:

الفارابی نے کتاب آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ میں افلاطون کی (Republic) کے لئے، عربی زبان میں متبادل لفظ ''مدینۃ'' استعمال کیا ہے، جبکہ وہ جمہوری حکومت کے لئے وہ ''مدینۃ الجماعیۃ'' کی ترکیب استعمال کرتے ہیں، ان کے بقول:

> مدينه الجماعيةهى التى قصد أهلها ان يكونوا أحرارا يعمل كل واحد منهم ماشاء.

[فارابى اراء اهل المدينة الفاضلة: ۱۱۰]

روز ینتھال (Roscenthal) نے فارابی کے اس لفظ کو (Democracy)

کے ہم معنیٰ کے طور پر لیا ہے، وہ لکھتا ہے:

Democracy (madina Jamia,iya) is marked by the freedom of its citizen to do as they please [political thought in medieval islam page.135]

اس سے جمہوریت کا اصطلاحی مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد لوگوں کی آزادنہ رضامندی سے قائم ہونے والی حکومت وریاست ہے، عربی میں ڈیموکریسی کو دیمقراطیۃ لکھتے ہیں جمہوریۃ: **دیمقراطیه ، وهی ماتکون بید اکثر الأهالي.**

[دائرة المعارف ۱۰/۵۳۴]

اصطلاحی جمہوریت کا لغوی مفہوم واضح ہو جانے کے بعد اس کے متبادل انگریزی لفظ (Democracy) کا تجزیہ ضروری ہے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس لفظ کا وہ فکری پس منظر کیا ہے جس کے تحت یہ اصطلاح عام ہوئی اس سلسلے میں ڈیوڈ ہیلڈ Devid held کی تحقیق قابل غور ہے۔

The word, democracy, Came into English in the sixteenth century from the French demokratie, its origins are Greek, 'Democracy' is derived from demokratia, the root meanings of which are demos(people) and kratos(rule).
Democracy means from of government in which in contradiction to monarchies and aristocracies, the people rule.(1)

[Models of Democracy.page1-2]

لفظ جمہوریت، انگریزی زبان میں سولہویں صدی عیسوی میں فرانسیسی سے آیا ہے، جب کہ اپنی اصل کے لحاظ سے یونانی زبان کے الفاظ ''ڈیماس'' (یعنی لوگ) اور

کراتوس (یعنی حاکمیت) سے ماخوذ ہے، گویا جمہوریت سے مراد ایسا طرز حکومت ہے جس میں بادشاہت اور اشرافیہ کے بالعکس، لوگ خود حاکم ہوں۔

رہا یہ سوال کہ یہ لفظ سیاسی اصطلاح کے طور پر کب اور کیسے مستعمل ہوا اس کا جواب جیمز میکریگر (James Macregor) اور والٹر (Walter) یوں دیتے ہیں:

> The word came into English usage in the seventeenth century to denoto to direct democracy, the kind of government that existed in Athens and other Greek city-states.(1)
>
> [Government by the people page 33-34]

لفظ جمہوریت اور (Democracy) کے بارے میں اس مختصر لغوی تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ یہ دونوں الفاظ اپنے لغوی روح کے لحاظ کے "عوام الناس کی حکومت / حاکمیت" پر دلالت کرتے ہیں، بطور سیاسی نظریئے کے یہ اصطلاحات یونانی زبان و تاریخ سے ماخوذ ہیں اور جدید سیاسی زندگی میں ان کا استعمال گزشتہ دو تین صدیوں سے عام ہوا ہے، جبکہ اردو زبان میں جمہوریت کی اصطلاح اٹھارہویں صدی سے مستعمل ہے۔

تاریخ انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان معاشروں کا قدیم ترین اور عملاً کامیاب ترین طرز حکومت بادشاہت رہا ہے، اس انداز حکمرانی میں جب مطلق العنانیت اور آمریت کا عنصر حد سے بڑھ گیا تو عوام الناس میں ردّ عمل پیدا ہونے لگا رعایا کی اکثریت اور عوام الناس کی اہمیت نے آگے بڑھ کر ایک طرز حکومت کا روپ دھار لیا تو وہ جمہوریت (Democracy) کہلایا، اور اپنی ارتقائی منازل طے کر کے "عوام کی منشا کے مطابق حکومت" کے طور پر مقبول ہوتا چلا گیا، اس سے معلوم ہوا جمہوریت ایک خاص تہذیب و تاریخ کا ثمر ہے، اور موجودہ جمہوریت ایک خاص تہذیب و تاریخ کا ثمر

ہے، نائیک صاحب کو اسلام کی روح میں یہ جمہوریت کہاں نظر آ گئی، مغرب کو خوش کرنے کے لئے جمہوریت کو قرآن سے برآمد کرنے کی کوشش کرنا معذرت خواہانہ جدیدیت ہے۔

جمہوریت اور شریعت ایک جائزہ:

سوال یہ نہیں کہ عصر حاضر کا جمہوری نظام قابل برداشت ہے یا نہیں؟ اور کچھ نہ کچھ شرعی تقاضے اس سے پورے ہوتے ہیں یا نہیں؟ بلکہ غور طلب امر یہ ہے کہ کیا عصر حاضر کا جمہوری نظام خواہ کسی بھی جمہوری ملک کے نظام کا ائینہ دار ہو، اس قابل ہے کہ ایسے شریعت کا تجویز کردہ نظام حکومت تسلیم کیا جائے، آیئے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

(۱) جمہوریت کی بنیاد اقلیت اور اکثریت پر قائم ہے، جبکہ قرآن وسنت نے شریعت اور دین اسلام کی بنیاد حق اور حقانیت پر لکھی ہے، چاہے اس کے پیروکار پوری دنیا میں پانچ ہی کیوں نہ ہوں۔

(۲) مکہ کے پورے قریش ایک طرف ان کا رخ ایک طرف اور حضور اکرم ﷺ نے آ کر کوہ صفا پر اکیلے کھڑے ہو کر پوری انسانیت کی اکثریت کو پانچ دس آدمیوں کی اقلیت حق، اور اہل حق کی طرف کیوں بلایا؟ اگر جمہوریت کے اصول دوٹوک ناقابل تردید وتنسیخ ہیں تو پھر یہاں ان اصولوں کو کیسے اپناؤ گے؟ بقول نائیک صاحب موجودہ جمہوریت بیعت اور شورائیت کی جدید شکل ہے، تو پھر اس کے ساتھ کیا کرو گے۔؟

(۳) جمہوریت کے نام پر دھونس اور دھاندلی، جبریت اور سرکشی اور فساد فی الارض کے جو کارنامے انجام دیئے جا رہے ہیں، ان کا مشاہدہ کھلی آنکھوں ہر شخص کر رہا ہے، گویا ملوکیت کے بعد جس دور کو جمہوریت کا سنہری دور کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جبریت کا سیاہ ترین دور ہے، اس میں پارلیمنٹ کو قانون سازی کے کلی اختیارات تفویض کر دیئے جاتے ہیں، اور وہ حلال اور حرام اور جائز وناجائز کے پروا کئے بغیر ہر قسم کی قانون سازی کی مجاز ہے۔ جیسا کہ چند سال پہلے برطانیہ اور امریکہ جمہوریت پسندوں

نے ایک بل پیش کیا جس میں مطالبہ تھا کہ دو مرد اگر ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو ان کو قانونی طور پر جائز قرار دینا چاہئے، چنانچہ اسمبلی میں اکثریت سے یہ بل پاس ہوا اور اب وہاں دو مرد شادی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں ایسی جمہوریت کا شریعت سے کیا تعلق؟ اور بقول نائیک صاحب اگر جمہوریت کو قرآن سے ثابت کیا جائے تو کیا قرآن ایسی جمہوریت کی اجازت دیتا ہے؟ کیونکہ اس کی اسلامی کاری کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ اسمبلی جو کچھ کرے گی وہ شریعت ہوگی، اور نائیک صاحب کو ایسے بلوں کو ٹھیک کہنا پڑے گا۔

(۴) جمہوری نمائندوں پر مشتمل پارلیمنٹ مطلق العنان ادارہ ہے، اور اس کے وضع کیا ہوا قانون اور دستور سب سے بالاتر قانون اور دستور ہے۔ اس سے بالاتر کوئی قانون نہیں، جس کے حوالے سے ان پر روک ٹوک کی جا سکے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں بہت سے دانشور، قلم کار اور سیاسی تجزیہ نگار قرآن وسنت کے سپریم لاء (Supreem law) ہونے پر انگلیاں اٹھاتے ہیں، ان کی نظر میں شریعت کو پارلیمنٹ سے بالاتر تسلیم کرنا پارلیمنٹ کی توہین ہے، اور اس کی بالادستی کو مجروح کرنا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ پارلیمنٹ کے ارکان متفقہ طور پر کوئی قانون وضع کر دیں تو کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی جیسا کہ ہمارے ہاں پہلے عائلی قوانین اور ابھی کچھ عرصہ قبل حدود ارڈیننس کو کھلونا بنایا گیا، تو کیا پارلیمنٹ کا یہ طریقہ کار درست ہے؟ نائیک صاحب کو اس طریقہ کار کو بھی درست کہنا پڑے گا، کیونکہ اس کے نزدیک جمہوریت قرآن سے ثابت ہے۔

(۵) جمہوریت خواہش نفس کا نام ہے کہ آپ کس کو ووٹ دینا چاہتے ہو اس کے لئے کوئی شرط نہیں، ہر شخص ووٹ دینے کا اہل ہے ملک کا صدر بھی میدان جمہوریت میں وہی وزن رکھتا ہے جو اس ملک کی ایک بھنگن رکھتی ہے بھنگن کی رائے اور ووٹ اور صدر پاکستان وزیر اعظم اور چیف آف آرمی سٹاف پاکستان کی رائے اور ووٹ کی ایک ہی قیمت اور ایک ہی وزن ہے، اسی پس منظر کے پیش نظر کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تو لا نہیں کرتے

ایک طرف ملک کا مفتی اعظم کی رائے ہے، ایک دانشور کھڑا ہے اس کی رائے، مدبر، فلاسفر، اسپشلسٹ، ڈاکٹر پروفیسر اور اعلیٰ درجے کے ادیب، مضمون نگار، تجزیہ نگار اور اعلیٰ سوچ کے مالک کھڑے ہیں اور دوسری طرف چوڑا چمار، نا تجربہ کار، اجڈ، جاہل، گنوار، ناہجاز کھڑا ہے، قرآن وسنت اس تصور مساوات کی صریحاً نفی کرتے ہیں جاہل اور عالم، متقی اور فاسق، مشرکین، منافقین، مختلف طبقات ہیں۔ یہ تقسیم صرف اخرت کے لئے نہیں اس دنیا کے لئے بھی ہے، اسلامی ریاست کا سربراہ جاہل شخص نہیں بن سکتا، نہ فاسق وفاجر کو امارات مل سکتی ہے، کیونکہ فسق وفجور کا خاتمہ ریاست کا بنیادی وظیفہ ہے، لیکن جمہوریت میں اس کی کوئی تحدید نہیں ہے، ہندو، عیسائی، یہودی، قادیانی، منکرین حدیث اور دشمنان صحابہ کو اس رائے دہی اور رائے زنی میں برابر کا حق حاصل ہے۔

لہذا مندرجہ بالا بحث سے واضح ہوگیا کہ نائیک صاحب جس مغربی جمہوریت کی اسلام کاری اور اس کو قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کا نہ صرف یہ کہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ اسلام کے سیاسی نظریئے کی ضد ہے، اس لئے نائیک صاحب کا اسلام کے ساتھ جمہوریت کا پیوند لگانا اور جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کرنا صریحاً غلط ہے۔

عورت اور قانون سازی:

نائیک صاحب ''اسلام میں عورت کی سیاسی حقوق'' کے بارے میں فرماتے ہیں، اسی طرح اسلام نے خواتین کو قانون سازی میں حصہ لینے کی اجازت بھی دی ہے، ایک مشہور روایت ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ صحابہ کرام کے ساتھ حق مہر کے مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خواہش تھی کہ حق مہر کی بالا حد مقرر کردی جائے کیونکہ نوجوانوں کے لئے نکاح مشکل ہوتا جارہا تھا، پیچھے سے ایک بوڑھی عورت اٹھی اور اس

نے قرآن مجید کی سورۃ نساء کی بیسویں آیت پڑھی:

﴿وَإِنْ أَرَدتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَاراً فَلاَ تَأْخُذُواْ مِنْهُ شَيْئاً أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَاناً وَإِثْماً مُّبِيناً﴾

اس کے بعد اس عورت نے کہا کہ جب قرآن یہ اجازت دیتا ہے کہ مہر میں مال کا ڈھیر بھی دیا جا سکتا ہے تو عمر رضی اللہ عنہ کون ہوتا ہے، حد مقرر کرنے والا۔[ص:۵۰]

اندازہ کیجئے کہ یہ کوئی عام خاتون تھی اور پھر بھی اسے یہ حق حاصل تھا کہ وہ خلیفہ وقت سے اختلاف کی جرأت کر سکے اور اس پر اعتراض کر سکے، اگر آج کل کی تکنیکی اصطلاحات میں بات کی جائے تو ہم کہیں گے کہ اس خاتون نے آئین کی ''خلاف ورزی'' پر اعتراض کیا تھا کیونکہ مسلمانوں کا آئین تو قرآن ہے، اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام عورت کو قانون سازی میں شرکت کا بھی حق دیتا ہے۔

[کتاب خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک ''بعنوان عورت کے سیاسی حقوق، ص:۵۱]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ مہر کے سلسلے میں اصحاب تفقہہ سے مشورہ فرما رہے تھے، ایک عورت نے اتفاقیہ گفتگو سنی اور اپنی رائے پیش کی اس رائے کو قانون سازی کا نام دینا بے بصیرتی ہے، کیونکہ اس تمام واقعہ سے کہیں بھی معلوم نہیں ہوتا، کہ قانون سازی ہو رہی تھی، اور نہ ہی وہ کوئی اجلاس تھا، جس کی پچھلی نشستوں سے کسی عورت نے اٹھ کر قانون سازی میں حصہ لیا، لیکن ڈاکٹر صاحب ایسے بیان کر رہے ہیں جیسے اسمبلی کا اجلاس ہو رہا ہو، ڈاکٹر صاحب کی ہی عادت ہے کہ وہ ہر جگہ عورت کی خوشنودی کے لئے کبھی عقلی دلائل پیش کرتے ہیں اور کبھی نقلی دلائل کی غلط سلط تشریح کر کے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش اور مغربی تقلید کے لئے تگ ودو کر رہے ہیں۔

اسلام کے مطابق کوئی عورت پیغمبر کیوں نہیں ہو سکتی؟

جناب ذاکر نائیک صاحب نے اپنی تقریر ''اسلام میں عورتوں کے حقوق'' کے سوالات اور جوابات میں ایک سوال کہ اسلام کے مطابق کوئی عورت پیغمبر کیوں نہیں

ہوسکتی؟ کے جواب میں کہتے ہیں اگر ''پیغمبر'' سے آپ کی مراد کوئی ایسی شخصیت ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا وحی نازل ہوتی ہے اور وہ کسی قوم کی رہنمائی بھی کرے، تو پھر آپ کی بات درست ہے کہ اسلام میں تو خاتون پیغمبر موجود نہیں ہے، قرآن واضح طور پر بتاتا ہے کہ گھر کا سربراہ مرد ہے...... لیکن اگر پیغمبر سے آپ کی مراد کوئی مقدس اور متبرک ہستی ہے تو پھر ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں بہترین مثال جو میں آپ کے سامنے پیش کرسکتا ہوں وہ حضرت مریم علیہا السلام کی ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کے علاوہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جیسی برگزیدہ خواتین بھی موجود ہیں، میں امید رکھتا ہوں آپ کو اپنے سوال کا جواب مل چکا ہوگا۔

[خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک بعنوان اسلام میں عورتوں کے حقوق، ص: ۸۵۔۸۶]

تمام جدیدیت پسند حضرات مغرب سے اور مغربی اصطلاحات سے مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور ان باتوں میں صرف عقل پر انحصار کرتے ہیں، یہ لوگ عقل کو ذریعہ علم سمجھنے کے بجائے ماخذ علم سمجھتے ہیں، اور عقل خود ان کی اپنی ہوتی ہے، لہٰذا اصلاً ان کا ماخذ ان کا ذہن ہوتا ہے اور اسی سے وہ فیصلے کرتے ہیں، کبھی کبھی کسی بات میں صریح نص ہوتی ہے جیسے یہاں اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں فرماتے ہیں:

﴿وما ارسلنا قبلك الا رجالا نوحي اليهم﴾[انبیاء: ۷]

ترجمہ: ''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ سے پہلے مگر ایسے مردوں کو جن کی جانب ہم وحی کرتے تھے۔''

جب اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ہم نے انبیاء صرف مردوں میں سے بنائے، تو پھر ڈاکٹر صاحب کو مزید حیل وحجت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ تعالیٰ کے امور میں کیا حکمت ہے یہ وہی زیادہ بہتر جانتا ہے اللہ اور اس کے رسول نے جن چیزوں کی حکمتیں بتادیں یا امور جن کی حکمتیں عام فہم ہیں، تو ہمیں ان ہی پر اکتفا کرنا چاہئے اور لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے اپنی جانب سے الفاظ قرآنی کے مختلف معانی نہیں گھڑنے چاہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی جہالت کا آپ اندازہ کیجئے کہ اسلام میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں، ڈاکٹر صاحب کو یہ پتہ نہیں کہ پیغمبر، رسول، نبی ایک خاص اصطلاح ہے، جو کہ خاص منہاج میں استعمال ہوتی ہے، کسی نے ابھی تک مقدس، پاک ہستی، متقی آدمی کو پیغمبر نہیں کہا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب مقدس اور معتبر ہستی کو پیغمبر کہتا ہے بے شک حضرت مریم علیہا السلام، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، حضرت فاطمہ اور عائشہ مقدس ہستیاں ہیں۔

انکا اپنا مرتبہ اور درجہ ہے لیکن ان کو پیغمبر کسی نے نہیں کہا ہے اور اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کہتا ہے کہ میرے خیال میں سوال کا جواب ہوا، جس سوال اور جواب میں کوئی مطابقت نہ ہو، اس سے کیا جواب ملے گا۔؟

صدر کی تعریف:

جناب ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب اپنی تقریر ''کیا قرآن اللہ کا کلام ہے؟ کے سوالات و جوابات میں ایک نومسلم طالبہ کے سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ

ان کا سوال یہ ہے کہ آج سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ سوچنے کا کام دل نہیں بلکہ دماغ کرتا ہے، تو پھر قرآن یہاں دل کا ذکر کیوں کر رہا ہے، پرانے زمانے میں لوگوں کا یہی خیال تھا کہ سوچنے کا کام دل کرتا ہے تو کیا یہاں نعوذ باللہ قرآن کا بیان غلط ہے؟

قرآن مجید کی ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿قال رب اشرح صدری ویسرلی امری واحلل عقدة من لسانی یفقهوا قولی﴾ [طه: ۲۵]

یہاں بھی یہی دعا کی جارہی ہے کہ میرا سینہ یعنی دل کھول دے، بات یہ ہے کہ عربی لفظ سے ایک مراد تو سینہ یا دل ہوتا ہے اور دوسرے مرکز، لفظ صدر کا ایک مطلب مرکز بھی ہوتا ہے اگر آپ کو کراچی جانے کا اتفاق ہو، تو وہاں ایک علاقہ ہے کراچی صدر، صدر کراچی سے مراد ہوتی ہے، کراچی صدر، یعنی لفظ صدر سے مراد مرکز ہوتا ہے، سو قرآن بھی یہاں یہی بتا رہا ہے، کہ سوچنے سمجھنے کے مرکز پر مہر لگادی جاتی ہے اور اس مرکز سے

مراد دماغ بھی ہوسکتا ہے اس لئے میں دعا کرتا ہوں کہ میرے فہم وادارک کے مرکز کو کھول دیں۔ امید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

[خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک ''بعنوان کیا قرآن اللہ کا کلام ہے'' ص: ۸۵ سرائے لاہور]

ڈاکٹر صاحب کا سوال کے آخر میں یہ کہنا کہ اُمید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔ یہ جواب بذات خود ڈاکٹر صاحب کے لئے اطمینان بخش جواب ہوگا، لیکن کوئی تعلیم یافتہ آدمی کیا کسی غیر تعلیم یافتہ آدمی کے لئے بھی یہ جواب اطمینان بخش نہ ہوگا، کیونکہ جب ڈاکٹر صاحب کو اس کا درست معنیٰ نہیں آیا، تو اپنی جہالت کا اقرار کرنے کے بجائے اوٹ پٹانگ جواب ہانک دیا، اور مطمئن ہوگئے کہ میں نے جواب دیا۔

نائیک صاحب سے جب دلوں پر مہر لگانے کی بات کہی گئی اور اس سے اس بات کا کوئی سائنسی جواب نہ بن پایا تو انہوں نے اس اعتراض کا حل نکالنے کی راہ یہ نکالی کہ صدر کا لفظ پیش کیا اور کہا کہ اس لفظ کا ترجمہ صرف دل ہی نہیں بلکہ مرکز بھی ہے، اور اس مرکز سے مراد دماغ بھی ہوسکتا ہے لہذا قرآن کی آیات کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے دلوں پر مہر لگادی جاتی ہے بلکہ یہ ہے کہ ان کی ذہانت (Intellect) پر مہر لگادی جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ حقیقت کے بارے میں سوچ نہیں سکتے۔

نائیک صاحب کی اس انوکھی تفسیر پر یہ اشکال پیدا ہوا کہ قرآن میں تو کہا گیا ہے کہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فانها لاتعمى الابصار ولكن تعمى القلوب التى فى الصدور﴾

حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں اور صدر کا معنیٰ سینہ یا چھاتی ہوتا ہے تو بقول ذاکر نائیک صاحب اگر صدر سے مراد ذہانت دماغ ہوتا ہے اور ذہن اور دماغ تو سینے میں نہیں ہوتے تو پھر قلب کے صدر میں ہونے کے کیا معنیٰ ہوئے؟ اگر تفسیر کا معیار عربی لغت ہی ٹھہرے، پھر

تو ہر باطل سے باطل نظریہ بھی لوگوں نے اسی قرآن سے ثابت کردکھایا ہے، اہل علم پر اس آیت میں صدر کے معنی وسط لینے کی معنوی بے ڈھنگی عین واضح ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ نائیک صاحب کو قرآن کی ایسی تاویل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، جو احادیث، پوری اسلامی تاریخ اسلامی علمیت اور روایت کو رد کرتی ہو؟ یہ تاویل اس قدر لغو ہے کہ اس پر کلام کرنا بھی تضیع اوقات ہے۔

نائیک صاحب قرآن سے سائنس کی مطابقت ثابت کرنے کے لئے جو آیات کی غلط سلط تاویلات کرتے ہیں کہ سوچنے کا کام صرف ذہن ہی کرتا ہے؟ یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ دل کا سوچنے کے عمل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں وہ اس لئے کہ علم نفسیات اور حیاتیات کی جدید تحقیقات کے مطابق دماغ اور دل میں ایک خاص نوعیت کا تعلق بہر حال موجود ہے، فرض کریں کل یہ تحقیقات مزید آگے بڑھ کر یہ ثابت کردیں کہ سوچنے کے عمل میں دل کا بھی کچھ دخل نہیں تو پھر نائیک صاحب کیا کرے گا؟ کیا پھر قرآنی الفاظ کی نئی تعبیر وتفسیر کرے گا؟ کیا اس سے لوگوں کا ایمان قرآن پر متزلزل نہیں ہوگا؟ اگر تفسیر کے لئے سائنس ہی معیار ومنہاج ہوتو پھر دل ہی کیا، سائنس روح کا بھی انکار کرتی ہے جبکہ قرآن واحادیث تو اس کے اثبات سے بھرے پڑے ہیں، سوال یہ ہے کہ اب اس روح کے بارے میں ذاکر نائیک صاحب کیا کہے گا، انہیں چاہئے کہ یا تو اس کا انکار کردیں یا پھر اس کی بھی کوئی نئی سائنسی توجیہہ کردیں حق بات یہی ہے کہ لوگ سائنس کو بنیاد بنا کر قرآن کی تفسیر کرتے ہیں وہ اس قسم کی عجیب وغریب باتیں کرتے ہیں جن کا اسلامی علمیت اور عقل وخرد سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا قلب کی تعبیر ذہانت اور صدر کی وسط کرنے والے نائیک صاحب نے یہ نہ سوچا کہ اس تعبیر کے بعد ان احادیث نبوی ﷺ کا کیا بنے گا، جن میں قلب کو دل ہی کہا گیا ہے، مثلاً ایک مشہور حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ان الفاظ میں روایت ہوا ہے۔

انّ فی الجسد لمضعة اذاصلحت ، صلح الجسد کله،
واذا فسدت فسد الجسد کله الاوھی القلب......

ترجمہ: ''بے شک جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، اگر وہ اصلاح یافتہ ہو تو سارا جسم صالح ہوتا ہے اگر گوشت کے اس لوتھڑے میں فساد پیدا ہو جائے، تو سارا جسم مفسد ہو جاتا ہے جان لو وہ قلب ہے''۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اس حدیث میں قلب کے لئے لفظ مضغۃ استعمال کیا گیا ہے جس کا معنیٰ قریب قریب گوشت کا لوتھڑا ہے، ظاہر سے بات ہے کہ ذہانت کو مضغۃ یعنی گوشت کا لوتھڑا کہنا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا، بلکہ مضغۃ تو دل ہی ہوسکتا ہے، نیز یہ بات سب کو معلوم ہے کہ یہ دل ہی ہے، جو گوشت کے لوتھڑے کی مانند ہوتا ہے نہ کہ ذہن جس سے صاف معلوم ہوا کہ اس حدیث میں قلب دل ہی کو کہا گیا ہے، ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے تقوے کے مقام کے بارے میں اپنے سینہ مبارک کے جانب اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ (التقویٰ ھھنا) تقویٰ یہاں ہوتا ہے، (یعنی دل میں) ایسے ہی ایک اور روایت ہے کہ جب کوئی مومن ایک گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نشان ڈال دیا جاتا ہے اگر وہ توبہ کرلے تو وہ سیاہ نشان مٹا دیا جاتا ہے اور اگر وہ مزید گناہ کرتا ہی چلا جائے تو وہ سیاہ نشان بھی بڑھتا چلا جاتا ہے، پھر اس سے توبہ کی توفیق سلب کی جاتی ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دل سے مراد دماغ ہے تو اس پر سیاہ نشان کے کیا معنیٰ ہوئے؟ نیز کیا سائنس یہ مانتی ہے کہ گناہ کے کام کرنے سے کسی شخص کی ذہانت یا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے؟ یہ چند احادیث تو برجستہ ہی بیان کردی گئی ہیں ورنہ اگر کتب احادیث کو بغور مطالعہ کیا جائے تو اس موضوع پر دسیوں احادیث پیش کی جاسکتی ہیں اب ایک طرف یہ احادیث ہیں جو درحقیقت قرآن مجید کی اصل شارح ہیں دوسری طرف وہ الل ٹپ لغوی تاویلات ہیں جو نائیک صاحب بیان کرتے ہیں سوال یہ ہے کہ ان میں کس کی بات مانی جائے؟ ظاہر ہے کہ احادیث کے سامنے ایسے لغوی بحثوں اور ظنی (Seculative) سائنسی اصولوں کی حیثیت مکھی کے پر جتنی بھی نہیں۔

فرض کریں ہم ایک لمحے کے لئے یہ دعویٰ مان لیتے ہیں کہ سوچنے کا کام ذہن ہی کرتا ہے دل نہیں کرتا تب بھی قرآنی اصطلاحِ قلب کی کوئی نئی تاویل کی ضرورت نہیں وہ اس لئے کہ حقیقت کا ادراک عقل کے بس کی بات ہی نہیں، عقل کی پرواز تو صرف وہاں تک ہے جہاں تک خواس خمسہ سے حاصل ہونے والے مشاہدات و تجربات اسے لے جاسکتے ہیں اور اس دنیا میں مابعد الطبعیاتی حقائق مثلاً (ذات باری تعالیٰ، مقصد انسانی، زندگی بعد الموت وغیرہ) پر کوئی مشاہدہ ممکن ہی نہیں، جس کے ذریعے ان حقائق کے حوالے سے عقل کوئی رائے قائم کر سکے، لہذا حقیقت کا ادراک سرے سے عقل کے ذریعے ممکن ہی نہیں، بلکہ اس کا ذریعہ تو قلب ہے، قرآن وحدیث نے حقیقت کے ادراک کے لئے اس قلب کی پاکیزگی اور تطہیر کی جانب اصل توجہ دلائی ہے۔

پس نائیک صاحب کو چاہیئے کہ وہ قرآن مجید کو ہی بنیاد بنا کر باقی نظریات کے حق و باطل کا فیصلہ کرے کیونکہ قرآن ہی اصل معیار اور علمیت ہے اور اس حقیقت کو قرآن نے اپنے لئے فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے کا معیار و میزان) اور الحق (واحد اور اصل حقیقت) کے الفاظ کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے یعنی قرآن خود آخری اور حتمی معیار اور میزان علم ہے جس میں تول کر ہر نظریئے کی حقانیت کو جانچا جانا چاہئے، نہ کہ سائنس کو معیار بنا کر قرآن کو اس پر جانچنا چاہئے۔

عورت کے چہرے کا پردہ:

نائیک صاحب ''اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات اور ان کے جوابات'' میں عورتوں کے بارے میں کہتا ہے ''مردوں کے لئے ناف سے لے کر گھٹنوں تک جسم کو ڈھانپنا ضروری ہے، جبکہ عورتوں کے لئے چہرہ اور کلائیوں تک ہاتھ کے سوا پورا جسم ڈھانپنا ضروری ہے، تاہم اگر وہ چاہیں تو یہ حصے بھی یعنی چہرہ اور ہاتھ بھی ڈھانپ سکتی ہے۔

[اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات اور ان کے جوابات ص ۲۸ بیکن بکس اردو بازار لاہور]

ایک پروگرام میں اس بارے میں کہتے ہیں کہ سورۃ نور کی آیت ۱۲۴ میں یہ نہیں کہا

گیا کہ چہرہ ڈھانکو اس میں لکھا ہے کہ سر کے اوپر کپڑا ڈھانکو اس میں چہرہ نہیں ہے، اس لئے حج کے دوران چہرہ ڈھانکنا حرام ہے تو اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ چہرہ ڈھانپنا فرض نہیں لیکن اگر کوئی ڈھانپنا چاہے تو اچھی بات ہے۔

چہرے کے پردے کے بارے میں فقہاء کرام کی عبارات:

اس میں صحابہ وتابعین اور فقہاء امت کی رائیں مختلف ہیں وہ یہ کہ عورتیں جب بضرورت گھروں سے باہر نکلیں تو وہ اپنا چہرہ اور ہتھیلیاں بھی لوگوں کے سامنے کھول سکتی ہیں یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔

بعض حضرات کا مذہب یہ ہے کہ عورت باہر نکلتے وقت اپنا چہرہ اور ہتھیلیاں کھول سکتی ہے، ان حضرات نے (الا ماظہر منہا) سے چہرہ اور ہتھیلیاں مراد لی ہے، اور ان دونوں کو حجاب سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اس لئے ان کے نزدیک ان کو کھلا رکھنا جائز ہے۔

بشرطیکہ فتنہ کا خطرہ نہ ہو، لیکن چونکہ عورت کی زینت کا سارا مرکز اس کا چہرہ ہی ہے اس لئے اس کو کھولنے میں فتنے کا خطرہ نہ ہونا شاذ ونادر ہے اس لئے انجام کار عام حالات میں ان کے نزدیک بھی چہرہ کھولنا جائز نہیں۔

بعض حضرات نے (ماظہر) سے برقعے اور جلباب وغیرہ مراد لیا ہے، چہرہ اور ہتھیلیاں انہوں نے مراد نہیں لیں، تو ان کے نزدیک چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنا مطلقاً جائز نہیں خواہ فتنہ کا خوف ہو یا فتنہ کا خوف نہ ہو۔

ائمہ اربعہ میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے مذہب اختیار کر کے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی مطلقاً اجازت نہیں دی، خواہ فتنہ کا خوف ہو یا نہ ہو۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اگر چہ دوسرا مذہب اختیار فرمایا مگر خوف فتنہ نہ ہونا شرط قرار دیا اور چونکہ عادۃً یہ شرط مفقود ہے اس لئے فقہاء نے بھی غیر محرموں کے سامنے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی اجازت نہیں دی۔

حنفیہ کا اصل مذہب چونکہ چہرے اور ہتھیلیوں کے حجاب سے مستثنیٰ ہونے کا ہے، اس لئے اس جگہ مذہب حنفیہ کی چند روایات نقل کی جاتی ہے جن میں بوجہ خوف فتنہ ممانعت کرنے کا حکم مذکور ہے چنانچہ فتح القدیر میں ہے۔

اعلم انه لاملازمة بين كونه ليس عورة وجواز النظر اليه، فحل النظر منوطٌ لعدم خشية الشهوة مع انتفاء العورة ولذا حرم النظر الى وجهها ووجه الامرد اذاشك في الشهوة ولا عورة. [فتح القدرى ۱/۱۸۱]

ترجمہ: ''سمجھ لو کہ کسی عضو کے ستر میں داخل نہ ہونے اور اس کی طرف نظر کے جائز ہونے میں کوئی تلازم نہیں، کیونکہ نظر کا جواز تو اس پر موقوف ہے کہ شہوت کا خطرہ نہ ہو، حالانکہ وہ عضو ستر میں داخل نہیں اس وجہ سے اجنبی عورت کا چہرہ یا کسی بے ریش لڑکے کے چہرے کی طرف نظر کرنا حرام ہے جب کہ شہوت پیدا ہونے میں شک ہو حالانکہ چہرہ ستر میں داخل نہیں۔

فتح القدیر کی مذکورہ عبارت سے خطرہ شہوت کی یہ تفسیر بھی معلوم ہوگئی کہ اگرچہ بالفعل کوئی شہوانی نیت نہ ہو مگر ایسا خیال پیدا ہو جانے کا شک ہو جب ایسا شک ہو تو نہ صرف اجنبی عورتوں کے بلکہ بے ریش لڑکوں کے چہرے کو دیکھنا بھی حرام ہے۔

اور خیال شہوت پیدا ہونے کی تشریح جامع الرموز میں یہ کی ہے کہ نفس میں اس کے قریب ہونے کا میلان پیدا ہو جائے اور یہ ظاہر ہے کہ نفس میں اتنا میلان بھی پیدا نہ ہو یہ چیز تو سلف کے زمانے میں شاذ تھی حدیث میں حضرت فضل کو ایک عورت کی طرف دیکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کا ان کے چہرے کو اپنے ہاتھ سے دوسری طرف پھیر دینا اس کی واضح دلیل ہے تو اس فساد کے زمانے میں کون یہ کہہ سکتا ہے کہ اس خطرے سے خالی ہے۔

شمس الائمۃ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ پر مفصل بحث کے بعد لکھا ہے:

وھذا کله اذا لم یکن النظر عن شهوة فان کان یعلم انه ان النظر اشتهیٰ لم یحل له النظر الی شیٔ [مبسوط ۱۰/۱۵۲]

ترجمہ: ''یہ چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف نظر کا جائز ہونا صرف اس صورت میں ہے، جب کہ یہ نظر شہوت سے نہ ہو اور اگر دیکھنے والا جانتا ہے کہ چہرہ دیکھنے سے برے خیالات پیدا ہو سکتے ہیں تو اس کو عورت کی کسی چیز کی طرف بھی نظر کرنا حلال نہیں۔

علامہ شامی نے ردالمحتار کی کتاب الکراہیۃ میں فرمایا ہے:

فان کان الشهوة اوشك امتنع النظر الیٰ وجهها فحل النظر مقیدة بعدم الشهوة والا فحرامٌ وهذا فی زمانهم واما فی زماننا فمنع من الشابة الالنظر لحاجة کقاض وشاهدٍ یحکم ویشهد ایضاً. قال فی شروط الصلاة وتمنع الشابة من کشف الوجه بین الرجال لالانه عورة بل لخوف الفتنة.

ترجمہ: ''اگر شہوت کا خطرہ یا شک ہو تو عورت کے چہرے کی طرف نظر ممنوع ہوگی، کیونکہ نظر کا حلال ہونا شہوت نہ ہونے کے ساتھ مشروط ہے اور جب یہ شرط نہ ہو تو حرام ہے اور یہ بات سلف کے زمانے کی تھی، لیکن ہمارے زمانے میں تو مطلقاً عورت کی طرف نظر ممنوع ہے مگر یہ کہ کسی حاجت شرعی کی وجہ سے نظر کرنا پڑے جیسے قاضی یا گواہ جس کو کسی واقعہ میں اس عورت کے متعلق شہادت یا فیصلہ دینا پڑے اور شروط نماز میں فرمایا، کہ جوان عورت کو اجنبی مردوں کے سامنے چہرہ کھولنا ممنوع ہے، نہ اس لئے کہ یہ ستر ہے بلکہ خوف فتنہ کی وجہ سے۔

اعلاء السنن میں علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ایک اعتراض:

وظنوا ان الحجاب المتعارف للنساء فی زماننا مخالف للدین، لان الشرع اباح للنساء کشف الوجه والکفین لاجانب واباح للرجال النظر الیهن، فیکون جسم النساء فی البیوت وحجبهن عن عیون الرجال ظلماً لهن کے جواب میں یہ فرماتے ہیں:

> وفی زمن النبی ﷺ کانت الضرورة غالبة لعموم الفقره شدة الاحتیاج الیٰ الخروج والفتنة مغلوبة لغلبة الصلاح، فلذلك لم یامر النبی ﷺ عامة النساءِ بالاحتجاب فی زمنه وفی زماننا الذی هو شر القروٰن غلبت الفتنة، وشاع الفساد بحیث لم یومن علیٰ کثیر من المحتجبات والمستورات واضمحلت الضرورات لکشف فلذلك شدد المسلمون فی الاحتجاب فقیاس زماننا الذی هو شر القرون علی زمان النبی ﷺ الذی هو خیر القرون قیاس للضد علی الضد وهو من عجائب القیاس۔
>
> [اعلاء السنن ۱۷/۳۷۳]

ترجمہ: ''حضور ﷺ کے زمانے میں لوگوں کے عموم فقر اور باہر جانے کی احتیاج کی وجہ سے ضرورت غالب تھی اور غلبہ صلاح کی وجہ سے فتنہ مغلوب تھا، یہی وجہ تھی کہ حضور ﷺ نے عام عورتوں کو پردے کا حکم نہیں دیا تھا، اور ہمارے زمانے میں جو کہ شر القرون ہے فتنے کا غلبہ ہے اور فساد پھیل چکا ہے اس طرح کہ پردہ میں بھی عورتیں محفوظ نہیں ہیں، کشف کی ضروریات مضمحل ہوگئے اسی وجہ سے مسلمانوں نے پردے کے بارے میں سختی کردی بس اس زمانے کا قیاس نبی ﷺ کے ساتھ قیاس کرنا قیاس ضد علی ضد ہے اور یہ قیاس کے عجائبات میں سے

ہے۔ان تمام عبارات کا حاصل یہ ہوا کہ باتفاق ائمہ اربعہ یہ حجاب ممنوع ہوگیا، یعنی برقعے چادر وغیرہ میں پورے بدن کو چھپا کر مگر صرف چہرہ اور ہتھیلیوں کو کھول کر مردوں کے سامنے آنا بالکل ممنوع ہوگیا، اب یہ جائز نہیں۔''

کیا رجم زنا بالجبر کے ساتھ خاص ہے؟

نائیک صاحب حجاب یا پردہ کے عنوان سے بیان کرتے ہیں کہ اسلامی قوانین کے تحت عورت سے جبراً (Rape) کے مرتکب شخص کے لئے موت کی سزا مقرر ہے۔

[اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات اور ان کے جوابات، ص:۳۰]

نائیک صاحب کا مغرب سے اپنی بے پناہ مرعوبیت کی وجہ سے اسلامی سزاؤں کو بھی مغربی تناظر میں پیش کر رہے ہیں، کیونکہ مغرب میں صرف سزا زنا بالجبر کے ساتھ مقید ہے اور زنا بالرضاء کے لئے کوئی سزا متعین نہیں، لہذا نائیک صاحب بھی یہی کہتے ہیں کہ اسلامی قوانین کے تحت عورت سے جبراً (Rape) کے مرتکب شخص کے لئے موت کی سزا مقرر ہے۔

حالانکہ قرآنی آیات اور احادیث مطلقاً ہیں اور اس میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ زنا بالجبر کی صورت میں یہ سزا متعین ہے۔اللہ تعالیٰ سورۃ نور میں فرماتے ہیں:

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾

[النور:۲]

زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو، اور اللہ کے قانون کے بارے میں قطعاً کوئی نرمی اختیار نہ کرو، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، اور ضروری ہے کہ ان کو سزا دیتے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ موجود رہے۔

اس آیت کریمہ میں صرف غیر محصن کی سزا سو کوڑوں کی صورت میں بیان کی ہے ،اور محصن کی سزا احادیث سے ثابت ہے ،لیکن مفسرین کی آراء یہاں نقل کی جاتی ہیں جن میں انہوں نے یہ بات واشگاف الفاظ میں بیان کی ہے کہ رجم کی سزا کے ساتھ کوئی بالجبر کی قید مقرر نہیں بلکہ مطلق زنا پر احصان کی صورت میں رجم کیا جائے گا۔

آیت جلد اور مفسرین کرام:

اب یہاں آیت جلد کے حکم کے بارے میں اُمت مسلمہ کے معتمد علیہ مفسرین کی آرا نقل کی جاتی ہیں، جہاں کہیں بھی یہ صراحت نہیں کہ سزا کا تعلق صرف جبر کے ساتھ ہے، رضا کے ساتھ نہیں۔

(۱) تفسیر طبری (ابن جریر طبری، م۳۱۰ھ)

”یقول تعالیٰ ذکرہ: من زنی من الرجال اوزنت من النساءِ وھو حد بکرٌ غیر محصن بزوجٍ فاجدوہ ضربا مائۃ جلدۃ“

اللہ تعالیٰ نے یہاں جن زانی مردوں اور زانیہ عورتوں کا تذکرہ کیا ہے،اور اس میں جس حد کا حکم ہے وہ صرف غیر محصن کنوارے اور غیر محصنہ کنواری کے لئے ہے، پس ان کو سو سو کوڑے مارے جائے۔

(۲) تفسیر الکشاف (جار اللہ زمخشر، م۵۲۸ھ)

”وھو حکم من لیس بمحصن منھم، فان المحصن حکمہ الرجم“

اس آیت کا حکم صرف کنوارے اور کنواری کے ارتکاب زنا کے لئے ہے،اور شادی شدہ زانی کے لئے رجم کا حکم ہے۔

(۳) احکام القرآن (ابن العربی، م۵۴۲ھ)

قولہ (فاجددوا) جعل اللہ کما تقدم حد الزنا قسمین رجما علی الشیب وجلد علی البکر وذالك لان قولہ (الزانیۃ والزانی فاجلد واکل واحدٍ منھما) عام فی کل زان ثم شرحت السنۃ حال الشیب.

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حد زنا کی دو قسمیں کر دی ہے، شادی شدہ کے لئے رجم اور غیر شادی شدہ کے لئے سو کوڑوں کی سزا ہے، فرمایا ''زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں کو کوڑے مارو'' تو یہ حکم ہر قسم کے زانی کے لئے عام تھا، پھر سنت نے شادی شدہ کی الگ صورت واضح کی۔

(۴) الجامع الاحکام القرآن (تفسیر قرطبی، امام قرطبی، م۶۷۱ھ)

(مائة جلدة) هذا حد الزانی الحد البالغ البكر وكذلك الزانية البكر الحرة...... واما المحصن من الاحرار فعليه الرجم دون الجلد

اس آیت میں ازاد، بالغ، کنوارے زانی کے لئے حد بیان کی گئی ہے اور اس طرح ازاد بالغہ کنواری زانیہ عورت کے لئے بھی یہی حد ہے، رہے ازاد محصن زانی اور محصنہ زانیہ، تو ان کے لئے رجم کی حد ہے، کوڑوں کی حد نہیں ہے۔

(۵) تفسیر القرآن العظیم المعروف تفسیر ابن کثیر (حافظ ابن کثیر م۷۷۶)

فاما اذا كان بكرًا لم يتزوج فان حده مائة جلدة كما فى الاية...... فامّا اذا كان محصناً وهو الذى قد وطى فى نكاح صحيح وهو بالغ عاقل فانه يرجم.

جب کوئی غیر شادی کنوارہ مرتکب زنا ہو۔ تو آیت کے بموجب اس کی سزا سو کوڑے ہیں، جب کوئی شادہ شدہ جس نے نکاح صحیح کے بعد مباشرت بھی کی ہو، مرتکب زنا ہو اور وہ عاقل بالغ ہو، تو اسے رجم کیا جائے گا۔

(۶) چنانچہ قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہے:

اجمع علماء الامة على ان الزانية والزانى اذا كانا حرين عاقين بالغين غير المحصنين فحدها ان يجلد كل واحدٍ منهما مائة جلدة بحكم هذه الأية.

علماء امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس آیت کے حکم کی رو سے ازاد، عاقل، بالغ

اور غیر محصن زانی اور غیر محصنہ زانیہ دونوں کو سو سو کوڑے مارے جائیں۔

(۷) علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

(مائة جلدة) هو حد الزاني الحد البالغ البكر وكذالك الزانية اما من كان محصناً من الاحرار فعليه الرجم بالسنة المتواترة وباجماع اهل العلم.

اس آیت میں ازاد بالغ، کنوارے زانی اور کنواری زانیہ کی حد بیان کی گئی ہے، مگر ازاد محصن زانی اور ازاد محصنہ زانیہ کو سنت متواترہ اور اجماع اہل علم کے مطابق رجم کرنے کا حکم ہے۔

ان تمام مفسرین کے اقوال میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ سزا رجم کا تعلق صرف زنا بالجبر کے ساتھ ہے، بلکہ ہر قسم کا زنا جس کا ثبوت شرعی طریقے کے ساتھ ہو جائے اس پر رجم کی سزا لاگو ہوگی۔

صحیح احادیث اور سزا رجم:

(۱) عن جابر بن عبد الله الانصاری ان رجلاً من اسلم اتى، سول اللّه صلى الله عليه وسلم فحدثه انه قدزنى، فشهد، على نفسه اربع شهادات، فامر به رسول الله صلى الله عليه فرجم وكان قد اُحصِنَ.

[صحيح بخاری: ٦٨١٤]

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ قبیلہ مسلم کا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا، اور کہنے لگا کہ اس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، یو اس نے چار دفعہ قسم کھاتے ہوئے اپنے جرم کا اعتراف کیا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رجم کئے جانے کا حکم دیا، اور پھر اسے رجم کیا گیا، اور وہ شخص شادی شدہ تھا۔

(۲) عن ابی هريرة انه قال اتى رجلٌ من المسلمين رسول

اللّٰہ ﷺ وھو فی المسجد فناداہ، فقال یا رسول اللّٰہ انی زنیت. فا. عرض عنہ فتنحیٰ تلقاء وجھہ فقال لہ یارسول انی زینت فاعرض عنہ حتی ثنیٰ ذلک علیہ اربع مرّاتٍ فلما شھد علی نفسہ اربع شھاداتٍ دعاہ رسول اللّٰہ ﷺ فقال ابک جنون؟ قال: لا! فھل اَحْصَنت؟ قال: نعم فقال رسول اللّٰہ علیہ وسلم: (اذھبوا بہ فارجموہ)

[صحیح مسلم: ۲/۶۶]

ترجمہ: ''سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ اس وقت مسجد میں تھے، اس شخص نے اوازدی اور کہا اے اللہ کے رسول! میں زنا کا مرتکب ہوا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف سے منہ پھیرلیا، اس نے دوبارہ کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں زنا کا مرتکب ہوا ہوں، آپ پھر بھی متوجہ نہ ہوئے، یہاں تک کہ اس نے چار دفعہ اپنی بات دہرائی، پھر جب اس نے چار مرتبہ قسم کھا کر اپنے جرم کا اقرار کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلا کر پوچھا ''تو پاگل تو نہیں'' بولا نہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا تو شادی شدہ ہے؟ وہ بولا جی ہاں (میں شادی شدہ ہوں) اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اسے لے جا کر سنگسار کردو۔

(۳) عن ابی ھریرۃ وزید ابن الجنھنی انھما قالا ان رجلاً من الاعراب اتی رسول اللّٰہ ﷺ فقال انشدک اللّٰہ الا قضیت لی بکتاب اللّٰہ، فقال الخصم الاٰخر وھو افقہ منہ، نعم، فاقض بیننا بکتاب اللّٰہ وائذن لی فقال رسول اللّٰہ ﷺ قال، قال ان ابنی کان عتیفاً علی ھذافزنی بامراتہ وانی اخبرت ان علی ابنی الرجم فافتدیت منہ بمائۃ شاۃ وولیدۃ، فساء

لت اهل العلم فاخبروني انما على ابني جددة مائة وتغريب عام وان على امراة هذاالرجل الرجم فقال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم والذى نفسي بيده كاقضين بينكما بكتاب اللّٰه، الوليده الغنم رود وعلى ابنك جلد ماة وتغريب عامٍ واغدُ ياانيس الى امراة هذا، فان اعترفت، فارجمها قال فغدا عليها فاعترفت فامربها رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فرجمت. [صحيح مسلم:۲/۶۹]

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور زید بن خالد جہنی دونوں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اعرابی آیا، اور کہنے لگا اے اللہ کے رسول! میں آپ کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ خدا کی کتاب کے مطابق میرا فیصلہ فرما دیں، اور دوسرا شخص جو پہلے سے زیادہ سمجھ دار تھا، کہنے لگا، مجھے اجازت دیجئے، کہ میں اصل واقعہ بیان کروں'' آپ نے فرمایا بیان کرو وہ بولا میرا لڑکا اس شخص کے ہاں مزدور تھا، اور اس کے بیوی سے زنا کا مرتکب ہوا مجھے بتایا گیا کہ میرے لڑکے پر لڑکے پر رجم کی سزا واجب ہے، تو میں نے اس کے فدیے کے طور پر اس آدمی کو سو بکریاں اور ایک لونڈی دی ہے، پھر جب میں نے اہل علم لوگوں سے مسئلہ دریافت کیا، تو انہوں بتایا، کہ میرے لڑکے پر سو کوڑوں کی سزا واجب ہے اور اس کے ساتھ ایک سال کی جلد وطنی اور عورت پر رجم کی سزا واجب ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا، لونڈیاں اور بکریاں واپس کر دی جائیں، تمہارے لڑکے پر سو کوڑوں کی سزا واجب ہے اور ایک سال کے لئے جلد وطنی اور اے انیس اس عورت کے ہاں جاؤ اگر وہ اپنے جرم کا اعتراف کرے، تو اسے رجم

کردینا پھر جب وہ (صحابی) اس عورت کے ہاں گئے، تو اس نے اعتراف جرم کرلیا، اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اسے رجم کیا گیا۔

(٤) وان الرجم فی کتاب اللّٰه حق علی من زنا اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینة او کان الحبل او الإعتراف. [صحیح مسلم: ٢/٦٥]

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کی کتاب میں رجم حق ہے اس پر جس نے حالت احصان میں زنا کیا چاہئے وہ عورتوں میں سے ہو یا مردوں میں سے جب بینۃ قائم ہوجائے اور حمل ظاہر ہوجائے یا اعتراف کرلے۔"

فقہاء امت اور رجم کی سزا:

شادی شدہ شخص اگر زنا کا ارتکاب کرے، تو صحیح احادیث کی رو سے اس کی سزا رجم ہے (یعنی سزا مار مار کر مار دیا جائے) امت کے تمام فقہاء کا اس بات پر اجماع واتفاق ہے اور کسی نے اس کے ساتھ زنا بالجبر کی قید نہیں لگائی ہے، لیکن نائیک صاحب مغرب کی اندھی تقلید اور نقالی کی وجہ سے یہ بیان فرماتے ہیں کہ اسلامی قوانین کے تحت زنا بالجبر کی سزا موت ہے، تو کیا زنا بالرضاء زنا نہیں ہے؟ یہاں چند فقہاء کی عبارات نقل کئے جارہے ہیں جس میں انہوں نے اس بات کا کوئی اظہار نہیں کیا ہے۔ کہ یہ سزا رجم صرف زنا بالجبر کے ساتھ مقید ہے۔ چنانچہ موسوعۃ الاجماع میں ہے۔

(١) ان المسلمین اجمعوا علی ان الزانی المحصن اذا زنی عامدًا، علماً، مختارًا فعده الرجم حتی یموت، وقالت الخوارج وبعض المعتزله بعدم الرجم.

[موسوعة الاجماع ١/٣٢٢]

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ زانی محصن جب عمدًا جانتے ہوئے اور اپنے اختیار سے زنا کا مرتکب ہو تو اس کی سزا رجم ہے یہاں تک کہ وہ مرجائے جبکہ خارجیوں اور بعض معتزلہ کا موقف نہ کرنے کا ہے۔

(۲) کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعہ میں ائمہ اربعہ کی متفقہ رائے اس بارے میں یہ بیان کی گئی ہے۔

اتفق الائمة علی ان من کملت فیه شروط الاحصان ثم زنا بامراة، قد کملت فیها شروط الاحصان بان کانت حرة بالغة عاقة مدخوله بها فی نکاح صحیح وهی مسلمة ، فهما زانیان. محصنان یجب علی کل واحد منهما الرجم حتی یموت.

[کتاب الفقه علی مذاهب الاربعة ج۵]

ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ جس شخص میں احصان کی سب شرطیں پائی جائیں اور پھر وہ کسی ایسی عورت سے زنا کا مرتکب ہو، جس میں بھی احصان کی تمام شرائط موجود ہوں، یعنی وہ ازاد عاقلہ بالغہ ہو، اور نکاح صحیح کے بعد مدخولہ ہو چکی ہو اور مسلمان بھی ہو تو ایسے شادی شدہ زانی اور شادی شدہ زانیہ میں سے ہر ایک کو رجم کرنا واجب ہے۔

ان تمام عبارات فقہاء اور احادیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ زنا کی سزا کا تعلق صرف جبر (Rabe) کے ساتھ نہیں کیونکہ حدیث ماغز اور غامدیہ میں ان کا خود اقرار کرنا اور حضرت ابوبکر صدیق وعمر رضی اللہ عنہ کا ان کو بار بار واپس جانے کو اور محض توبہ واستغفار کرنے کو کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ زنا بالجبر نہ تھا ورنہ ایک آدمی زنا بالجبر کرے اور خود اکے اقرار کرے اور پھر ان حضرات کی کوشش یہ ہو کہ ان کو کوڑے بھی نہ لگیں اور پھر ان کی جنازے بھی پڑھیں گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی توبہ کے عظیم ہونے کی خبر بھی دی، پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے زنا بالجبر کا ارتکاب کیا ہو۔

روایت اور گواہی اور نائیک صاحب:

نائیک صاحب ''عورتوں اور مردوں کا گواہی کا مسئلہ'' کے عنوان سے فرماتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کم وبیش ۲۲۲۰ احادیث وروایت کیں، اور انہیں ثقہ اور مصدقہ گردانا جاتا ہے، حالانکہ تنہا انہوں نے روایت کیں اور یہ اس امر کا بین ثبوت

ہے کہ ایک عورت کی گواہی بھی اسلام میں قابل قبول ہے۔

[اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات اور ان کے جوابات،ص:٦٦]

نائیک صاحب کو معلوم ہی نہیں کہ روایت اور گواہی میں بہت فرق ہے، گواہی میں لفظ شہادت بولا جاتا ہے، جیسا کہ الفقہ الاسلامی وادلتہ میں الاستاد الدکتور وحبۃ الزہیلی شہادت کی تعریف میں بیان کرتے ہیں:

الشهادة: مصدر شهد من الشهود بمعنىٰ الحضور، وهي لغة: خبرٌ قاطع بلفظ الشهادة في مجلس القضاء.

[الافقه الاسلامی وادلة ٨/٦٠٢٨]

اس میں واضح طور پر لفظ شہادت کا ذکر ہے اسی طرح فتح القدیر میں جلد۲ صفحہ٦ پر بھی یہی تعریف کی ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ شہادت کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں کہ" **بلفظ الشهادت فی مجلس القاضی** "کہ گواہی یہ ہے کہ لفظ شہادت کے ساتھ قاضی کی مجلس میں گواہی دے،اور روایت سے مراد حضور اکرم ﷺ کے قول وفعل کو نقل کرنا ہے اور روایت اور گواہی ایک ہوتی تو پھر روایان حدیث اشہد کہتے ،امام نووی رحمۃ اللہ علیہ مقدمہ مسلم کی شرح میں روایت اور گواہی کا فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اعلم ان الخبر والشهادة يشتركان في اوصافٍ ويفترقان في اوصافٍ فيشتركان في اشتراط الاسلام والعقل والبلوغ والعدالة والمرواة وضبط الخبر والمشهود به عند التحمل والاداء ويفترقان في الحرية والذكورية والعددَ والتهمة وقبول الفرع مع وجود الاصل فيقبل خبر العبد والمراة والواحد ورواية الفرع مع حضور الاصل الذي هو شيخه. [شرح للنواوی علی الصحیح المسلم ٦٠]

ترجمہ:" جان لو کہ خبر اور شہادت چند اوصاف میں مشترک ہے اور چند

میں متفرق پس شہادت اور خبر شرط اسلام عقل، بلوغ عدالت، مروت ضبط
خبر اور مشہود بہ کا تحمہ اور اداء کے وقت ضبط میں مشترک ہے، اور جدا جدا
ہیں ازادی، زکورت عدد تھمت اور قبول فرغ کی اصل کے موجودگی کے
ساتھ ساتھ، پس عبد، عورت اور ایک آدمی کی اور فرع کا اصل کے ہوتے
ہوئے خبر قبول کیا جائے گا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ روایت اور شہادت دو الگ الگ چیزیں ہیں، بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو خبر ہونے کی حیثیت سے تو معتبر اور قابل اعتماد ہوتی ہیں مگر بحیثیت شہادت ناقابل قبول ہوتی ہیں، ان دونوں میں یہ فرق اسلام ہی میں نہیں بلکہ ہماری اس دنیا میں قانونی طور پر یہ فرق مسلم ہے، تار، ٹیلی فون، ریڈیو، ٹی وی اور خطوط کے ذریعے جو خبریں آتی ہیں، اگر ان کا معتبر ہونا معلوم ہو تو بحیثیت خبر ساری دنیا میں قبول کی جاتی ہیں اور ان پر اعتماد کرتے ہوئے سارے کام انجام پاتے ہیں لیکن کسی مقدمہ اور معاملے کی شہادت کی حیثیت سے ان خبروں کو دنیا کی کوئی عدالت تسلیم نہیں کرتی بلکہ یہ ضروری ہوتا ہے کہ گواہ، مجسٹریٹ کے سامنے حاضر ہو کر شہادت دے تاکہ گواہی اور شہادت کے جو اصول ہیں ان پر ان کو پرکھا جا سکے اور شہادت کے غلط یا صحیح ہونے کا کوئی فیصلہ کیا جا سکے، لہذا نائیک صاحب کا گواہی اور روایت کو ایک سمجھنا لاعلمی اور جہالت کا بیّن ثبوت ہے۔

رؤیت ہلال اور نائیک صاحب:

نائیک صاحب "مردوں اور عورتوں کی گواہی کا مسئلہ" کے عنوان سے کہتے ہیں۔

غور کیجئے کہ ایک عورت کی گواہی رمضان المبارک کے روزے شروع کرنے جیسے اہم عمل کے لئے جسے اسلام کے چار میں سے ایک ستون کا درجہ حاصل ہے، کافی شمار کی جاتی ہے بعض فقہاء کی رائے میں رمضان المبارک کے آغاز کے لئے ایک گواہ کافی ہے تاہم اس کے اختتام کے لئے دو گواہ ضروری ہیں اور اس میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ [اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات اور ان کے جوابات، ص:٦٦]

نائیک صاحب کا یہ دعویٰ کہ رمضان کا چاند دیکھنے کے لئے ایک عورت کی گواہی کافی ہے، اور اس کے اختتام کے لئے دو گواہ ضروری ہیں، اور اس میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں اور پھر اس سے تمام مہینوں کی رویت کے لئے نصاب شہادت میں مرد و عورت کی تخصیص کا شرط ختم کرنا غلط فہمی اور شہادت و خبر میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے غلط ہے۔

نائیک صاحب کو یہ پتہ نہیں کہ رویت ہلال کا مسئلہ شہادت کا معاملہ ہے اور رویت ہلال کے معاملہ کو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے شہادت کا معاملہ قرار دیا ہے، البتہ صرف رمضان کے چاند میں خبر کو کافی سمجھا ہے، بشرطیکہ خبر دینے والا ثقہ مسلمان ہو، ترمذی، ابوداؤد، نسائی وغیرہ میں ایک اعرابی کے اور ابوداؤد کی روایت میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے ثابت ہے کہ صرف ایک ثقہ مسلمان کی خبر پر آنحضرت ﷺ نے رمضان شروع کرنے کا اور روزہ رکھنے کا اعلان فرما دیا، نصاب شہادت کو ضروری نہ سمجھا، رمضان کے علاوہ دوسرے ہر چاند کی شہادت کے لئے نصاب شہادت اور اس کی تمام شرائط کو ضروری قرار دیا گیا، اور سب فقہائے امت کا اس پر اتفاق ہے اور سنن دارقطنی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہلال عید کے لئے دو آدمیوں سے کم کی شہادت کافی نہیں قرار دیا۔

نائیک صاحب کا یہ کہنا بھی بے اصل ہے کہ رمضان کے اختتام کے لئے دو گواہ ضروری ہے اور اس میں مرد و عورت کا کوئی تخصیص نہیں حالانکہ فقہاء نے اس کے لئے نصاب شہادت شرط قرار دیا ہے اور نصاب شہادت دو مرد یا دو عورتیں اور ایک مرد ہیں اور اسی پر تصریحات موجود ہیں۔

علامہ علاء الدین ابی بکر بن سعود الکاسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وان کان بالسماء علۃ فلا تقبل فیہ الاشہادۃ رجلین او رجل وامراتین مسلمین حرین عاقلین بالغین غیر محدودین فی قذف. [البدائع والصنائع ۲/۲۲۲]

اگر مطلع صاف تھا تو پھر دو آدمیوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی جو مسلمان ہو، ازاد ہو، عاقل ہو، بالغ ہو اور غیر محدود بالقذف ہو کی شہادت قبول کی جائیگی۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

(وشرط للفطر) مع العلة والعدالة (نصاب الشهادة ولفظ اشهد) وفي الرد(نصاب الشهادة) اى على الاموالي وهو رجلان اورجلٌ وامرأتان.[الشامية۲/۳۸۶]

عید الفطر کی رویت کے لئے جب مطلع صاف نہ ہو نصاب شہادت شرط ہے اور لفظ اشہد، ردالمختار میں ہے کہ نصاب الشہادۃ علی الاموال دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہیں۔

وراثت کی تقسیم میں نائیک صاحب کی غلطی:

نائیک صاحب وراثت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ متوفی کے بچے نہ ہونے کی صورت میں بیوی کو شوہر کے ورثہ سے اٹھواں حصہ جبکہ بیوی کے ترکہ سے شوہر کو چوتھا حصہ ملتا ہے۔

اگر متوفی کے بچے ہوں تو بیوی کو شوہر کے ترکے سے چوتھائی اور شوہر کو بیوی کے ترکہ سے نصف ملتا ہے۔

اگر متوفی بے اولاد ہو تو اس کے ماں باپ بھی فوت ہو چکے ہوں تو اس کی بہن کو وراثت میں جو حصہ ملتا ہے وہ بھائی کی نسبت نصف ہوتا ہے۔

نائیک صاحب کے پاس لاآدری کا ڈھال نہیں ہر سوال کا جواب دینے کی ناکام کوشش کررہے ہیں چاہے وہ غلط ہو یا ٹھیک، اسی طرح آپ نے میراث کے بارے میں جو ضابطہ بیان کیا ہے یہ بھی صریح غلط ہے، اس کے بارے میں قرآن مجید میں واضح بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ

بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ﴾

[النساء: ۲۱]

ترجمہ: ''اور تمہارا ہی آدھا مال جو کہ چھوڑ مریں تمہاری عورتیں اگر نہ ہو ان کے اولاد اور اگر ان کے اولاد ہے تو تمہارے واسطے چوتھائی ہے اس میں سے جو چھوڑ گئیں بعد وصیت کے جو کر گئیں یا بعد قرض کی اور عورتوں کے لئے چوتھائی مال ہے اس میں سے جو چھوڑ مرو تم اگر نہ ہو تمہارے اولاد اور اگر تمہارے اولاد اور اگر تمہارے اولاد ہو، تو ان کے لئے اٹھواں حصہ ہے، اسی میں سے جو تم نے چھوٹا ہے بعد وصیت کے جو تم کر مرو یا قرض کے۔ [تفسیر عثمانی ۱/ ۲۵۹]

اس آیت کریمہ میں صاف صاف اور واضح بیان ہے کہ مرد کو اس کی عورت کے مال میں سے آدھا مال ملے گا، اگر عورت کے کچھ اولاد نہ ہو اور اگر عورت کے اولاد ہو خواہ ایک ہی بیٹا یا بیٹی ہو اور اسی مرد سے ہو یا دوسرے مرد سے تو مرد کو عورت کے مال میں سے ایک چوتھائی مال ملے گا، قرض اور وصیت کے بعد۔

اور اسی طرح عورت کو اس کے خاوند کے مال میں سے چوتھائی حصہ ملے گا اگر مرد کے اولاد کچھ نہ ہو اور اگر مرد کے اولاد ہے تو عورت کو اٹھواں حصہ ملے گا، یہ واضح قانون بھی نائیک صاحب کو نہ سوجھا اور غلط قانون کو بیان کیا جو نائیک صاحب کی جہالت کا بین ثبوت ہے۔

تقلید اور نائیک صاحب:

جناب ذاکر نائیک صاحب اپنی تقریر ''مسلمان مختلف فرقوں یعنی مکاتب فکر میں کیوں بٹے ہوئے ہیں'' میں کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں فرمان خداوندی ہے۔

''جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور کئی فرقے بن گئے تم کو اے پیغمبر ان سے کوئی غرض نہیں ان کا کام خدا کے حوالے ہے وہی ان کو بتلائے گا جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔ [سورۃ انعام:٦]

اس آیت میں اللہ کا فرمان ہے کہ اپنے آپ کو ان لوگوں سے الگ کرلیں جو اپنے دین کو تقسیم کرتے ہیں، اور مسلمانوں میں فرقہ بندی کرتے ہیں مگر جب کسی مسلمان سے پوچھا جاتا ہے کہ تم کون ہو؟ تو جواب میں وہ بتاتا ہے کہ میں سنی ہوں یا شیعہ ہوں بعض اپنے آپ کو شافعی، مالکی، حنفی اور حنبلی بھی کہتے ہیں یا پھر یہ کہ میں دیوبندی ہوں یا بریلوی۔

اس قسم کے جواب دینے والوں سے مزید کوئی یہ پوچھ سکتا ہے، ہمارے پیارے رسول ﷺ کون تھے؟ کیا وہ حنفی یا شافعی، حنبلی یا مالکی تھے، تو جواب یقینی یہی ہے کہ نہیں آپ (صرف) مسلمان تھے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے دوسرے رسول اور پیغمبر تھے اگر کوئی شخص مسلمان ہونے کا دعویدار ہے تو اس سوال کے جواب میں کہ ''تم کون ہو؟'' یہ کہنا چاہئے کہ میں مسلمان ہو؟ یہ کہنا چاہئے کہ میں مسلمان ہوں حنفی یا شافعی نہیں۔

[اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات اور ان کے جوابات ص:۹۲]

ڈاکٹر صاحب ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''چار فقہی مسالک (حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی) کا آغاز دوسری صدی ہجری میں ہوا، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ فقہی مسالک اس وقت سامنے آئے جب اسلام خاصا مستحکم ہو چکا تھا، یہ بات بھی ضروری نہیں ہے، کہ ایک مسلمان چار فقہی مسالک میں سے کسی ایک کو لازماً اختیار کرے، اگر وہ دین کا کافی علم رکھتا ہے، اور علم کی بنیاد پر مختلف فقہی

مسالک کے درمیان موازنہ کر کے اپنے لئے راہ منتخب کر سکتا ہے تو ایسے شخص کو اپنے علم پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

نائیک صاحب کا یہ کہنا کہ کیا ہمارے پیغمبر ﷺ حنفی، شافعی، حنبلی یا مالکی تھے، نائیک صاحب کو یہ جاننا چاہئے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں ان مسائل کا یہ نام نہ تھا کہ یہ فقہ حنفی کے مسائل ہیں، جیسے قرآن پاک کی ساتوں قرأتیں حضور ﷺ کے زمانے میں موجود تھیں لیکن اس وقت اس کا نام قاری عاصم کی قرأت یا قاری حمزہ کی قرأت نہیں تھا، اسی طرح صحاح ستہ کی صحیح احادیث رسول اللہ ﷺ کی ہی احادیث ہیں، لیکن اس وقت ان احادیث کو یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ بخاری کی حدیث ہے، وہ نسائی کی، فلاں ابن ماجہ کی اور فلاں کی۔

ان باتوں سے نائیک صاحب، تقلید سے فرار ہے، اور اس کو اتنا معلوم نہیں کہ فقہاء عوام نے ایک زبردست انتظامی مصلحت کے تحت تقلید کو عمل کے لئے احتیاط فرمالیا اور یہ فتوی دیدیا۔

کہ اب لوگوں کو صرف تقلید شخصی پر عمل کرنا واجب ہے۔

تقلید شخصی کی ضرورت:

خیر القرون میں چونکہ اتباع ہویٰ کا غلبہ نہ تھا وہاں تقلید شخصی اور غیر شخصی دونوں قسموں میں اختیار تھا جس پر چاہے عمل کرے مگر قرون مابعد یعنی تیسری صدی کے اوائل میں جب غلبہ ہوس وہوا زیادہ ہوا، اور انحضرت ﷺ کی پیش گئی کے مطابق ہوائے نفسانی لوگوں کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی، تو علمائے وقت نے باجماع یہ ضروری سمجھا کہ تقلید غیر شخصی سے لوگوں کو منع کیا جاوے اور صرف تقلید شخصی ہی واجب سمجھی جاوے ورنہ تقلید غیر شخصی کی اڑ میں لوگ محض اپنے نفس کے مقلد بن جائیں گے جو کہ باجماع امت حرام ہے۔

نائیک صاحب مسلمانوں کے لئے چار فقہی مسالک میں کسی ایک پر عمل کرنے کو غیر لازمی قرار دے رہے ہیں، لیکن ساتھ ساتھ اس کے لئے کی شرائط ہیں؟ کونسے علم کی بنیاد

پر تقلید واجب نہیں وہ نہیں متعین کرتے ہیں، تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے لوگ جان بوجھ کر اور بہت سے غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہو جائیں گے مثلاً ایک شخص کو سردی کے موسم میں خون نکل آیا تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نہیں ٹوٹا، وہ اپنی تن اسانی کی وجہ سے اس وقت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کر کے بلا وضو نماز پڑھ لے گا پھر اس کے تھوڑی دیر بعد اگر اس نے کسی عورت کو چھولیا تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا وضو جاتا رہا اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک برقرار ہے، اس کی تن آسانی اس موقع پر اسے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کا سبق دے گی، اور پھر وہ بلا وضو نماز کے لئے کھڑا ہو جائے گا غرض جس امام کے قول میں اسے آرام اور فائدے نظر آئے گا، اسے اختیار کرے گا، اور جس قول میں کوئی مضرت نظر آئے یا خواہشات کی قربانی دینی پڑے اسے چھوڑ دے گا، اور ایسا بھی ہوگا، کہ اس کا نفس اسی قول کی صحت کی دلیلیں سمجھائے گا، جو اس کے لئے زیادہ اسان ہی اور وہ بالکل غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہوگا، چنانچہ صحیح مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے شارح شیخ الاسلام علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ علیہ تقلید شخصی کے وجوب کی وجہ بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ووجهه انه لوجاز اتباع ای مذهب شاء لافضی الی ان یلتقط رخص المذاهب متبعاً هواه ویتخیر بین التحلیل والتحریم والوجوب والجواز، وذالك یودی الی انحلال، ربقه التكلیف بخلاف العصر الاولِ فانه لم تكن المذاهب الوافیة باحكام الحوادث مهذبة وعرفت، فعلی، هذا یلزمه ان یجتهد فی اختیارمذهب یقلده علی التعین. [المجموع شرح المذهب، للنووی،۱/۹۱]

یہ ہے کہ اگر اس بات کی اجازت ہو کہ انسان جس فقہی مذہب کی چاہی پیروی کر لیا کریں تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ ہر مذہب سے آسانیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی خواہشات نفس کے مطابق ان پر عمل کیا کریں گے، حلال وحرام اور واجب وجائز کے

احکام کا سارا اختیار فوراً لوگوں کا مل جائے گا، اور بالآخر شرعی احکام کی پابندیاں بالکل کھل کر رہ جائیں گی، البتہ پہلے زمانہ میں تقلید شخصی اس لئے ممکن نہ تھی کہ فقہی مذاہب مکمل طور سے مدون اور معروف ومشہور نہ تھے، (لیکن اب جبکہ مذاہب فقہیہ مدّون اور مشہور ہو چکے) ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ کوشش کر کے کوئی ایک مذہب چن لے، اور پھر معین طور سے اسی کی تقلید کر لے۔

صرف ائمہ اربعہ کی تقلید کیوں؟ •

تقلید صرف ائمہ اربعہ کی کیوں کی جاتی ہے، کیا کوئی دوسرا امام اس درجے کا نہیں ہوا، جس کی تقلید کی جائے اور کیا ائمہ اربعہ کی تقلید کا حکم کسی نص میں وارد ہوا ہے۔؟

ائمہ اربعہ پر سلسلہ تقلید ختم ہونا کوئی امر عقلی یا شرعی نہیں بلکہ محض اتفاقی ہے، کہ مشیت خداوندی سے ان چار مذاہب کے سواء اور جتنے مذاہب تھے ختم ہو گئے اور مٹ کر ''کان لم یکن'' ہو گئے، دو چار یا دس بیس یا پچاس سو اقوال واحکام اگر آج ان کے منقول وموجود بھی ہوں تو وہ کوئی مستقل مذہب نہیں بن سکتا، کہ لوگ اس کی تقلید کیا کریں، کیونکہ اگر ان سو پچاس احکام میں ان کی تقلید کر بھی لی تو باقی ہزاروں مسائل میں کیا کریں گے، اب جبکہ دیکھا گیا کہ کل مذاہب سوائے ان چار مذہبوں کے ختم ہو گئے تو ناچار سلسلہ تقلید انہیں میں منحصر ہو گیا۔

علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ تقلید شخصی کے رواج کے اسباب بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ''اسلامی ممالک میں لوگوں نے ان ہی چاروں اماموں کی تقلید پر قناعت کی اور دیگر اماموں کی تقلید کرنے والوں کا نام ونشان بھی نہ رہا لوگوں نے اختلاف مسالک کا دروازہ بند کر دیا، کیونکہ علوم کی اصطلاحوں کی کثرت ہو گئی، اور اجتہاد کے مقام تک پہنچنے کی لوگوں میں صلاحیت نہیں رہی اور اس لئے بھی کہ ہر کس وناکس مجتہد نہ بن بیٹھے، اس لئے صراحت سے کہہ

دیا کہ اب لوگ اجتہاد کی صلاحیت سے عاجز ہیں اور سب تقلید کے لئے مجبور ہیں۔ [مقدمہ ابن خلدون مترجم ،۲/۳۴۳]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اعلم انّ فیٰ الاخذ بهذه المذاهب الاربعة مصلحة عظيمة وفی الاعراض عنها كلها مفسدة كبيرة ونحن نبين ذالك بوجوہٍ. [عقد الجبد فی احکام الاجتهاد وتقليد، ۳۱]

یاد رہے کہ ان چار مذاہب کو اختیار کرنے میں بڑی عظیم مصلحت ہے، اور ان سب کے سب سے اعراض کرنے میں بڑے مفاسد ہیں۔

حضرت شاہ صاحب ایک اور مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

انّ هذه المذاهب الاربعة المدونة المحددة قد اجتمعت الامة اومن يعتدبه منها، على جواز تقليد ها الیٰ يومنا هذا، وفی ذالك من المصالح مالايخفیٰ، لاسيما فی هذه الايام التی قصرت فيها الهمم جدًا واشربت النفوس الهویٰ، واعجب كل ذی، رأی برأية. [حجة الله البالغة، ۱/۱۵۴]

”بلاشبہ چار مذاہب جو مدّون ہو کر تحریری شکل میں موجود ہیں، ان کی تقلید کے جائز ہونے پر تمام امت کا اجماع ہے اور اس میں جو مصلحت ہیں وہ پوشیدہ نہیں، بالخصوص اس زمانے میں جبکہ ہمتیں پست ہو چکی ہیں، خواہش پرستی لوگوں کی گھٹی میں پڑ گئی ہے اور ہر ایک صاحب رائے اپنی رائے پر گھمنڈ کرنے لگا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ تقلید کن مسائل میں کی جاتی ہے؟ تقلید کون کرتا ہے؟ اور کس کی کرتا ہے؟ تقلید تو صرف اس غرض کے لئے کی جاتی ہے کہ قرآن وسنت سے جو مختلف المعانی احکام ثابت ہو رہے ہیں ان میں سے کوئی ایک معنیٰ متعین کرنے کے لئے اپنی ذات رائے استعمال کرنے کی بجائے سلف میں سے کسی صالح مجتہد کی رائے اور فہم

پر اعتماد کیا جائے، ظاہر ہے یہ دوسری صورت انتہائی محتاط اور صواب ہے، کیونکہ ائمہ متجہدین متقدمین کے پاس جو علم وفہم، تقویٰ وللّٰہیت، حافظہ وذکاوت، دین ودیانت اور قرب عہد رسالت جیسے اوصاف تھے، بعد کے لوگوں میں اور بالخصوص آج کے لوگوں میں ویسے اوصاف نہیں ہیں، چنانچہ جو اعتماد ائمہ مجتہدین پر کیا جاسکتا ہے، بعد کے لوگوں پر نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی آدمی اپنے اوپر ویسا اعتماد کرسکتا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب ہر ایک کو اپنے علم کی بنیاد پر مسالک کے درمیان کھلی اجازت دیتا ہے، اور اس علم کا معیار اور پیمانہ متعین نہیں کرتے کہ اس علم کا معیا کیا ہوگا؟ نائیک صاحب کا ایسا کہنے سے یقیناً لوگو کا نئی راہیں تلاش کرنے میں قوی اندیشہ ہوتا ہے، اپنی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کبھی ایک موقف اختیار کرے گا اور کبھی دوسرا لہذا اس سے بچنا چاہئے اور ان تحقیقات کے بجائے ائمہ پر اعتماد کرنا چاہئے۔

ٹائی اور نائیک صاحب:

نائیک صاحب حجاب کے لئے چھ اصول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بعض علماء اور محققین کا اصرار ہے کہ چہرہ اور ہاتھ بھی احکام حجاب میں شامل ہیں باقی پانچ اصول مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں ہیں۔

(۱) لباس اتنا تنگ نہ ہو کہ جسمانی خطوط نمایاں ہو رہے ہو۔

(۲) لباس باریک نہ ہو جس سے جسم جھلک رہا ہو۔

(۳) لباس ایسا بھڑکیلا نہ ہو کہ صنف مخالف کے لئے سان کشش بن جائے۔

(۴) لباس صنف مخالف سے مماثلت نہ رکھتا ہو۔

(۵) ایسا لباس نہ پہنا جائے جو کافروں کے لباس سے مشابہ ہو۔

[اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراض اور ان کے جوابات، ص:۲۸،۲۹]

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں، ٹائی پہننا حرام نہیں عرب توپ پہنتے ہیں تلک لگانا ہندو کی نشانی ہے، ٹائی کلچرل ڈریس تھا۔

نائیک صاحب کا ٹائی کو کلچرل ڈریس قرار دینا صحیح نہیں، کیونکہ لباس خالصتاً تہذیبی وثقافتی مسئلہ نہیں، بلکہ یہ ساتھ ساتھ دینی مسئلہ بھی ہے لہذا یہ کہنا کہ لباس کا دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں یہ غلط ہے، اس لئے کہ متلعق واضح ہدایات اور تعلیمات ملتی ہیں۔

چنانچہ قرآن کریم نے بی لباس کا ذکر کیا اور لباس کے مقاصد ذکر فرماتے ہیں:

یبنی ادم قد انزلنا علیکم لباساً یواری سواتکم وریشاً.

[اعراف: ۲۵]

نبی ﷺ کی احادیث بھی لباس کے متعلق بے شمار ہیں بہت سے ایسے لباس تھے جو نبی کریم ﷺ کی بعثت کے وقت موجود تھے، لیکن حضور ﷺ نے ان کے استعمال سے مسلمانوں کو منع فرمایا، مثال کے طور پر اس وقت مرد ریشم بھی پہن لیا کرتے تھے، مگر آپ ﷺ نے مردوں کو ریشم پہننے سے منع فرمادیا، لباس امور عادت میں سے ہے، اور امور عادت کے بارے میں شریعت نے بالکل آزاد بھی نہیں چھوڑ دیا کہ جو جی میں آئے کرو بلکہ ہر عادی مسئلہ میں عمومی ہدایات اور کچھ جزوی ہدایات دے دی ہے۔

اور اس کے بعد آزادی دی ہے، یہ نہیں کہ لباس کے بارے میں شریعت ودین نے کوئی ہدایت وتعلیم ہی نہ دی ہو اور یہ بھی نہیں کہ شریعت نے لباس کی خاص شکل وصورت اور وردی متعین کردی ہو کہ یہی اسلامی لباس ہے، اور ہر مسلمان کو بس یہی پہننا پڑے گا، البتہ شریعت نے لباس کے بارے میں چند اصول مقرر کئے ہیں جن ایک اصول لباس مشابہت اور نقالی والا نہ ہو، جس کو نائیک صاحب بھی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ ایسا لباس نہ پہنا جائے جو کافروں کے لباس سے مشابہ ہو، یعنی ایسا مخصوص لباس جو کافروں کے مذہب کی پہنچان ہو۔

تشبہ کا مفہوم:

اپنی ہیت اور وضع تبدیل کر کے دوسری قوم کی وضع اور ہیت اختیار کرنے کا نام تشبہ ہے کافروں کا معاشرہ اور تمدن اور لباس اختیار کرنا، در پردہ ان کی سیادت اور برتری کو

تسلیم کرنا ہے کیا یہ صریح ظلم نہیں کہ دعویٰ تو ایمان کا ہو، اسلام کا ہو، اور اس کے رسول کے محبت کا ہو اور صورت، ہیئت اور وضع وقطع اور لباس وبال اس کے دشمنوں والے ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو فکر ہوئی کہ عجمیوں کے ساتھ اختلاط سے اسلامی امتیازات میں کوئی فرق نہ آ جائے تو ایک طرف مسلمانوں کو تاکید کی کہ اغیار کے تشبہ سے سخت پرہیز کریں، تو دوسری طرف غیروں کے لئے فرمان جاری کئے کہ وہ اپنے امتیازات میں نمایاں رہیں اور اہل اسلام کی وضع وقطع اختیار نہ کریں، چنانچہ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فارس میں مقیم مسلمانوں کو یہ فرمان بھیجا کہ مشرکین اور کفار کے لباس سے دور رہیں، نائیک صاحب کا لباس بالفرض اگر تشبہ، بالکفار نہ بھی ہو تو شبہ بالفساق میں تو کوئی شبہ نہیں اور نائیک صاحب کا ٹائی کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ کلچرل ڈریس ہے یہ صحیح نہیں کیونکہ اس کا ایک پس منظر ہے، جس کے تناظر میں کفار اس کو پہنتی ہے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا جب پہلا ایڈیشن شائع ہوا، تو اس میں ٹائی کے متعلق بتایا گیا تھا کہ اس سے مراد وہ نشان ہے جو صلیب مقدس کی علامت کے طور پر عیسائی گلے میں ڈالتے ہیں جس طرح ہندو مذہب کا شعار زنار ہے اسی طرح ٹائی عیسائیوں کا مذہبی شعار ہے اور کسی قوم کے مذہبی شعار کو اپنانا نہ صرف، ناجائز ہے بلکہ اسلامی غیرت وحمیت کے بھی خلاف ہے۔

بلا وضو قرآن چھونا:

ایک پروگرام ''گفتگو میں نائیک صاحب کہتے ہیں کہ قرآن کو بے وضو چھو سکتے ہیں البتہ وضو کرنا اچھا ہے۔ اور ''لایمسه الا المطهرون '' آیت میں مطہرون سے صرف فرشتے مراد ہیں اور قرآن سے لوح محفوظ والی قرآن مراد ہے لہذا کوئی آدمی کتابی شکل میں قرآن بلا وضو چھو سکتا ہے قرآن اور احادیث سے ثابت ہے، کہ قرآن کو چھونے کے لئے طہارت شرط ہے، صحابہ اور تابعین کا اسی پر عمل رہا ہے اور اسی پر اجماع امت ہے قرآن پاک کی آیت ''لایمسه الا المطهرون '' [واقعہ:۷۹] اس کی بڑی دلیل ہے

لیکن نائیک صاحب مطہرون سے صرف فرشتے مراد لیتے ہیں، ایئے مفسرین کی اراء کے روشنی میں اس بات کا تجزیہ کرتے ہیں کہ کیا یہ بات درست ہے کہ اس سے صرف فرشتے مراد ہیں، اور یہ حکم انسانوں کے لئے نہیں ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے:

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اپنی معرکتہ الاراء تفسیر الجامع لاحکام القرآن میں اس آیت پر بحث کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

المراد بالکتاب المصحف الذی بایدینا، وھو الا ظھر وقد روی مالك وغیرہ ان فی کتاب عمرو بن حزم الذی کتب له رسول اللّٰه ﷺ ونسختا(من محمد النبی الی شر جیل بن عبد کلال والحرث بن عبد کلال ونعیم بن عبد کلال ذی رعین ومعافر وھمدان اما بعد وکان فی کتابه. الا یمس القرآن طاھر. [الجامع الاحکام القرآن ۱۷/۲۲۵]

”کتاب سے مراد وہ مصحف ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہوتی ہے، اور یہ ظاہر قول ہے اور مالک اور اس کے علاوہ اور لوگوں نے روایت کی ہے کہ وہ لفظ عمرو بن حزم جس کو نبی ﷺ نے اس کے لئے لکھا تھا، جس کا نسخہ من محمد النبی الی شرجیل بن عبد کلال والحرث بن عبد کلال ونعیم بن عبد کلال قیل ذی رعین ومعافر وھمدان اما بعد اور اس خط میں تھا کہ کوئی قرآن کو مس نہ کرے مگر بحالت طہارت۔“

صاحب تفسیر روح البیان کی رائے:

صاحب تفسیر روح البیان اس آیت کی تفسیر کے بارے میں فرماتے ہیں:

اوللقران فالمراد المطھرون من الاحداث مطلقاً فیکون

نفیاً جمعنیٰ النهی ای لاینبغی ان یمسه الا من کان علی طهارة من الادناس کالحدث والجنابة ونحوهما...... وفی الفقه لایجوز لمحدث بالحدث الاصغر وهو ما یوجب الوضو، مس المصحف الابغلاف المنفصل.

[تفسیر روح البیان: ۹/۲۳۶،۲۳۷]

''یا یہ صفت سے قرآن کے لئے پس اس سے مراد احداث سے پاک ہونا ہے پس نفی بمعنی نہیں ہوگا، یعنی یہ مناسب نہیں کہ اس قرآن کو کوئی چھوئے مگر وہ آدمی جو احداث اور گندگی سے پاک ہو جیسے حدث اور جنابت اور فقہ میں ہے کہ جائز نہیں کہ کوئی حدث اصغر کے ساتھ مصحف کو چھولے مگر غلاف منفصل کے ساتھ۔''

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں مطہرون سے مراد مطہرون میں الاحداث ہیں۔

صاحب احکام القرآن للجصاص کی رائے:

صاحب احکام القرآن للجصاص کی رائے اس آیت کے بارے میں یہ ہے:

قوله تعالیٰ انه لقران کریم فی کتاب مکنون لایمسه الاالمطهرون روی عن سلمان انه قال لایمس القرآن الا المطهرون فقراء القران ولم یمس المصحف حین لم یکن علی وضوء وعن انس بن مالك فی حدیث اسلام عمر قال فقال لاخته اعطونی الکتاب الذی کنتم تقرؤن فقالت انك رجسٌ انه لامیسه الا المطهرون فقم فاغتسل او توضا، فتوضاء ثم اخذ الکتب فقرأه وذکر الحدیث وعن سعد انه امرابنه. بالوضوء لمس المصحف وعن ابن عمر مثله وکره الحسن والنخعی مس المصحف علی غیر وضوء. [احکام القرآن للجصاص، ۳/۴۱۵،۴۱۶]

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ (لایمسہ الا المطہرون) سلمان سے روایت ہے کہ اس نے کہا کہ قرآن کو نہ چھولیا جائے مگر پاک ہوکر، پس اس نے قرآن کی تلاوت کی اور مصحف کو نہیں چھولیا، اس وقت تک جب تک وہ وضو میں نہیں تھا، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اس حدیث میں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے بارے میں مروی ہے فرماتے ہیں، آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن سے کہا کہ مجھے وہ کتاب دیجئے جو تم پڑھتے تھے، پس اس نے کہا، کہ تم ناپاک ہو اور اس قرآن کو مس نہیں کرتا مگر پاک لوگ، اٹھو اور غسل کرو یا وضوء کرو پس آپ نے وضو کیا اور پھر قرآن لے لیا اور اس کو پڑھا اور اسی طرح حدیث ذکر کی حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کو مس مصحف کے لئے وضو کا حکم دیا، ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اس کی مثل روایت ہے اور حسن اور نخعی نے مس مصحف کو بلا وضو چھونا مکروہ لکھا ہے اس کے علاوہ احادیث میں متعدد جگہ قرآن کو بلا وضوء چھونے کی ممانعت ہے، موطاء امام مالک میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر باب قائم کیا ہے الامر بالوضوء لمن مس القرآن۔

مالك عن عبد الله بن ابی بکر بن حزم ان فی الکتاب الذی کتبه رسول الله صلی الله علیه واله وسلم لعمرو بن حزم ان لایمس القرآن الاطاهر. [موطاء امام مالك، ص:۱۵۸]

مالک عبداللہ بن ابی بکر بن حزم سے روایت کرتے ہیں کہ وہ خط جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم کے لئے لکھا تھا کہ کوئی قرآن کو نہ چھوئے مگر پاک ہوکر۔

رحمۃ الامۃ صفحہ ۱۵ پر عبدالرحمٰن الشافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اجماعی طور پر بے وضو شخص کے لئے قرآن کا چھونا اور اٹھانا جائز نہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، تابعین عظام اور مجتہدین تو طہارت کے بغیر قرآن چھونے کو جائز نہیں سمجھتے

لیکن آج کے متجددین ہیں کہ بغیر کسی دلیل کے ان سب کی مخالفت کر رہے ہیں۔

تعدّد ازدواج النبی ﷺ کے اسباب اور نائیک صاحب:

اگر آپ رسول خدا ﷺ کی تمام شادیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ شادیاں یا تو معاشرتی اصلاحات کے لئے کی گئی تھی یا سیاسی وجوہات ومفادات سے اپنی خواہش کی تسکین کے لئے یہ شادیاں ہرگز نہیں کی گئیں تھیں۔

آپ ﷺ نے پہلا نکاح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کیا، اس وقت نبی کریم ﷺ کی اپنی عمر ۲۵ سال تھی، جب کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۴۰ سال تھی، جب کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حیات رہیں، آپ ﷺ نے دوسرا نکاح نہیں فرمایا آنحضرت ﷺ کی عمر ۵۰ سال تھی جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔

اپنی عمر کے ۵۳ ویں سال سے ۵۶ سال کے درمیان آپ نے تمام نکاح فرمائے، اگر ان شادیوں کی وجوہات جنسی ہوتیں تو آپ ﷺ نوجوانی میں زیادہ نکاح فرماتے کیونکہ علم طب تو یہ کہتا ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ جنسی خواہش گھٹتی چلی جاتی ہے، صرف دو نکاح ایسے ہیں جو آپ ﷺ نے اپنی مرضی سے فرمائے، حضرت خدیجہ کے ساتھ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ باقی تمام نکاح حالات کے پیش نظر یا سیاسی وجوہات کے لئے یا معاشرتی اصلاح کے لئے کئے گئے تھے۔

[خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب: بعنوان اسلام میں خواتین کے حقوق جدید یا فرسودہ، ص:۸۸]

یہ الفاظ نائیک صاحب نے ایک سوال کے جواب میں کہ اسلام میں زیادہ سے زیادہ چار شادیوں کی اجازت ہے، تو پھر پیغمبر اسلام نے گیارہ شادیاں کیوں کیں؟ کہے ہیں، نائیک صاحب کو علماء حق کے انداز میں یہ کہنا چاہتے تھے کہ حضور ﷺ کی ہر شادی میں کوئی نہ کوئی حکمت تھی تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن سیاسی مفادات اور وجوہات کا لفظ استعمال کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ موجودہ معاشرے میں ہر آدمی سیاسی مفادات کا معنیٰ جانتے ہیں کہ سیاسی مفادات کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ شادیوں میں جو حکمتیں تھیں وھبۃ الزحیلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اس طرح بیان کی ہے:

والنبی ﷺ راعی الحکمة البالغة والمصلحة الاسلامية فی اختيار كل زوجة من زوجاته، فاما خديجه فهی الزوجة الاولیٰ التی رزق منها الاولاد وذلك متفق مع سنة الفطرة واما سودة بنت زمعة، فلتعو يضها عن زوجها بعد رجوعها من هجرة الحبشة الثانية وهی من المهاجرات الاوليات فلو عادت الیٰ اهلها لعذبوها وفتنوها عن دينها، واما عائشة وحفصة فلاكرام صاحبيه وزيريه ابی بكر وعمر رضی اللہ عنہما، وامّا زينب بنت جحش فلابطال توابع عادة التبنی مثل تحريم التزوج بزوجة المتبنی، واما جويرية بنت الحارث سيد قومه بنی المصطلق فمن اجل اعتاق الاسری وكان ذالك سببا فی اسلام بنی المصطلق، واما زينب بنت حزيمة الملقبة ام المساكين فلتعويضها عن زوجها وهو عبد الله بن جحش الذی قتل فی احد، فلم يدعها ارمة تقاسی المتاعب ولا حزان.

وكذلك زواجه بام مسلمة(واسمها هند) كال لتعزيتها بفقدزوجها ابی سلمة، ولفضلها وجودة رائيها يوم الحديبيه.

واما زواجه بام هبيبه: رملة بنت ابی سفيان بن حرب فلتاليف قلوب قومها وادخالهم فی الاسلام بعد أن هاجرت مع زوجها عبيد اللّه بن جحش الیٰ الحبشة الهجرة الثانية فتنصر هناك وثبتت هی علی الاسلام

واما زواجه بصفية بنت حي بن أخطب سيدة بني قريضة والنضير من سبي خيبر، فمن اجل تحريرها من الاسر واعتاقها. واما ميمونه بنت الحارث الهلالية وكان اسمها برّة اخر ازواجه بعد وفاة زوجها الثاني ابي رهنم بن عبد العزى فلتشغب قرابتها في بني هاشم وبني محزوم.

[التفسير المنير، ٤/٢٤٥]

علامہ وھبۃ الزحیلی نے حضور ﷺ کی شادیوں میں جو حکمتیں بیان کی ہے ان میں ایک ایسا نہیں جس پر سیاسی مفادات ہو بلکہ ہر شادی کی خاطر آپ ﷺ نے شادی کی ہے، کیونکہ ازواج مطہرات سے شادیوں میں آپ ﷺ کا کیا مفادات پوشیدہ تھے، مثلاً ام سلمہ رضی اللہ عنہا جن کے بچے بھی تھے آپ نے انہیں پالا ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے شادی صرف اس کی خاوند ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کی تعزیت اور حدیبیہ میں آپ کی رائے کی افضلیت کی وجہ سے کی تھی، تو یہاں کیا سیاسی مفاد تھے، اسی طرح حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے اس وجہ سے شادی کی تھی کہ اگر وہ اپنی اہل کی طرف واپس ہو جاتی تو وہ ان کو سخت سزا دیتی اور دین سے پھیر لیتے، تو یہاں کیا سیاسی مفادات تھے۔ اسی طرح ہر شادی میں کچھ نہ کچھ حکمت ضرور تھی اور اس حکمت کے تحت آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے کئے تھے۔

نائیک صاحب کو سیاسی مصلحت اور مفادات کی جگہ حکمت کا لفظ استعمال کرنا چاہئے تھا۔

کمپوزنگ: قاری ضیاء الدین اشرفی

موجودہ کمپوزر: مدرسہ عثمانیہ للعلوم دینیہ بہادرآباد کراچی۔ ڈیزائنر مکتبہ بشری کراچی۔

موبائل 0322-2362808-0300-2400544

مختصراً یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے بہت سارے مسائل میں جمہور سے ہٹ کر موقف اختیار کیا ہے، محض اپنے عقل اور سوچ کی بنیاد پر جو کہ جمہور کا موقف نہیں اس لئے عوام کو چاہئے اندھا اعتماد ہر شخص پر نہ کریں جب تک کہ وہ کسی مضبوط عالم سے اس کی تصدیق نہ کرلیں ورنہ بجائے رہ ہدایت کے راہ ضلالت پر گامزن ہو جائینگے۔

اللہ پاک ہم سب کی گمراہی سے حفاظت فرمائے۔ (آمین)

وآخر دعونا ان الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين

تمت

..... ☆☆☆ .....